MAKTABA AL - RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258-3435

مئی ۹۳

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

سب سے زیادہ نادان وہ شخص ہے جو
بھلانے والی باتوں کو یاد رکھے اور
یاد رکھنے والی باتوں کو بھول جائے

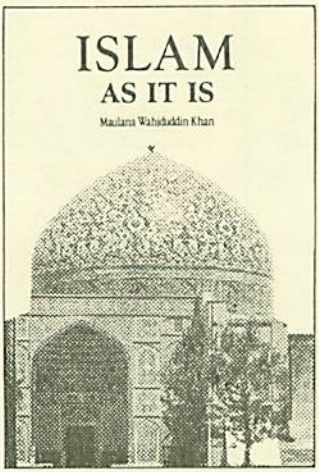

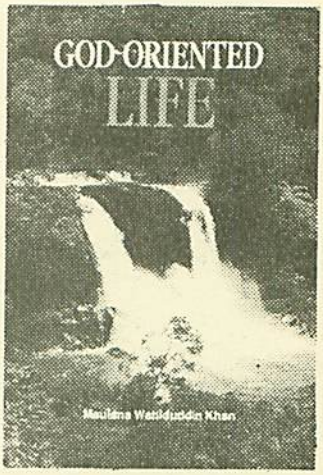

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۳ ، شمارہ ۱۹۸

مسجد اور مسلمان	۴
اجودھیا کا مسئلہ	۱۰
اجودھیا اور اس کے بعد	۱۵
اجودھیا کا سبق	۳۱
آگے کی طرف	۳۴
ہمت کا امتحان	۳۸
سب سے بڑا خطرہ	۴۱
ناامیدی میں امید	۴۶
ایک تقریر	۴۹

Cover photograph:
SULTAN OMAR ALI SAIFUDDIN MOSQUE
Brunei Darussalam

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs 6; Annual Subscription Rs 72/ $25 (Air-mail)

مسجد اور مسلمان

اس وقت میں اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ پوری زمین صاف کر کے وہاں ایک عارضی مندر بنا دیا گیا جس پر روزانہ پوجا اور درشن کیا جا رہا ہے۔

۶ دسمبر کے اس واقعہ کے بعد اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اس لیے اب ہمیں نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا۔ کیوں کہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے بابری مسجد کے سوال پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ خاص طور پر آخری چھ سال کے دوران وہ جان و مال کی زبردست قربانی دے کر اس مہم کو چلاتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود بابری مسجد کو بچانا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں سابقہ انداز کی احتجاجی تحریک جاری رکھنا سراسر نادانی ہوگی۔ ایسی تحریک کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کیوں کہ اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا ہے۔ جس عمل کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ عمل اسلام کے مطابق نہیں۔

۶ دسمبر سے پہلے ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بابری مسجد کو کس طرح بچائیں۔ ۶ دسمبر کے بعد اب یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح بچایا جائے اور اجودھیا کی قسم کے واقعہ کو کسی اور مقام پر دہرانے کو کس طرح روکا جائے۔ شریعت کی روشنی میں پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد اس کے حل کے لیے میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے جو کہ اس طرح ہے :

مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنے ایجی ٹیشن کو ختم کر دیں۔

ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔

گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ کے ایکٹ (۱۹۹۱) کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔

جیسا کہ واضح ہے، اجودھیا کے مسئلہ میں تین فریق ہیں۔ مسلمان، ہندو اور حکومت۔ مذکورہ فارمولے میں ان تینوں کو لیا گیا ہے۔ تینوں سے ایسی مانگ کی گئی ہے جو پوری طرح ان کے لیے قابل عمل ہے۔ اگر تینوں فریق، اس فارمولے کو مان لیں تو اس کے بعد انشاء اللہ انڈیا کی تاریخ

ں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ ملک میں
ن قائم ہوگا۔ خوف اور تشدد کی فضا ختم ہو جائے گی جو دیش کی ترقی کے راستہ میں مستقل
کاوٹ بنی ہوئی ہے۔

دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ مسجد اور مسلمان کا فرق ہے۔ یہ دونوں چیزیں
یک دوسرے سے الگ ہیں اور ان میں نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ مسجد کا حکم شریعت
ں کیا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مسجد سے متعلق مسلمانوں کے رویہ کے بارہ میں شرعی حکم کیا ہے۔
یک مسئلہ کا تعلق مسجد کی اپنی حیثیت سے ہے۔ دوسرے مسئلہ کا تعلق مسجد کے بارہ میں مسلمانوں
کی ذمہ داری سے۔

یہ دونوں باتیں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ شریعت کے اعتبار
سے جو مسجد کی پوزیشن ہے وہی اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری بھی ہے۔ یا مسلمانوں کی جو
ذمہ داری ہے وہی خود مسجد کی اپنی پوزیشن بھی ہے۔

فرق کے اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
ہوئی تو کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیت اتری وہ یہ نہیں تھی
ہ طھر الکعبۃ من الاصنام (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) بلکہ یہ کہا گیا کہ وثیابك فطھر (اپنے
پیڑے کو پاک کر۔ یعنی اخلاق کو درست کرو) مکی دور میں اسی قسم کی آیتیں اترتی رہیں۔

ان آیتوں کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے۔ بلکہ
ن کا تعلق صرف اس مسئلہ سے تھا کہ کہ جیسے حالات میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔

اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے اب بابری مسجد کے معاملہ میں غور کیجئے۔ جہاں تک نفس مسجد
کا تعلق ہے، اس کے بارہ میں متفقہ طور پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ جس جگہ جائز طور پر ایک مسجد بنا دی
جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لیے مسجد کی جگہ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رہتا۔

دوسرا پہلو یہ کہ کسی مسجد کے ساتھ اگر اس قسم کے واقعات پیش آئیں جیسے واقعات اجودھیا
میں پیش آئے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔ ایسے معاملہ میں ایک صورت
یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کی طرح مسلمان یہ کہہ کر اس سے الگ

ہو جائیں کہ مسجد خدا کی چیز ہے، وہی جس طرح چاہے گا اس کی حفاظت کرے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان خاموش نہ رہیں بلکہ وہ مسجد کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو ان کے اس عمل کی بھی ایک حد ہوگی۔ ایک حد تک جانے کے بعد انھیں دوبارہ اس معاملہ میں چپ ہو جانا پڑے گا۔ یہ حد قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ: لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعہا (البقرہ ۲۸۶) اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ یعنی کسی مومن فرد یا کسی مومن گروہ کے بس میں جتنا کچھ ہو، صرف اتنے ہی کے لیے وہ مکلف ہے۔ اپنے بس سے باہر کی ذمہ داری کسی مسلم فرد یا کسی مسلم گروہ کے اوپر نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کا حکم بتانے کے لیے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ مسجد جس جگہ جائز طور پر بنا دی جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہو جاتی ہے۔ مگر مسجد کے تئیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جب سوال یہ ہو کہ کسی مسجد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے تو وہاں مذکورہ مسئلہ بیان کرنا اصل سوال کا صحیح جواب نہ ہوگا۔ اس دوسری صورت میں مسلمانوں کی اپنی حالت ان کے لیے شرعی حکم کا فیصلہ کرے گی نہ کہ نظری اعتبار سے مسجد کی شرعی حیثیت۔

اس شرعی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بابری مسجد اور مسلمان کے مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب اس معاملہ میں مسلمانوں کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ان کے اوپر بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بابری مسجد کو بچانا چاہا مگر وہ اس کو نہ بچا سکے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری کی آخری حد آچکی ہے۔ اب وہ شریعت کی رو سے بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاملہ سے اپنے آپ کو الگ کر کے اس کو مستقبل کے حالات کے حوالے کر دیں۔

۶ دسمبر کے حادثہ کے بعد اس معاملہ میں نوعی اور بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اب مسئلہ بابری مسجد کے تحفظ کا نہیں ہے۔ اب اصل مسئلہ خود مسلمانانِ ہند کے تحفظ کا ہے۔ اب اگر مسلمان اپنی اس احتجاجی تحریک کو مزید جاری رکھیں جو اس اشو پر وہ ۶ دسمبر سے پہلے چلا رہے

تھے تو یقینی طور پر اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ مذکورہ مقام پر دوبارہ بابری مسجد بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس عملاً جو نتیجہ نکلے گا وہ یہ کہ مسلمان پورے ملک میں فسادات کی زد میں آجائیں گے۔ وہ بے شمار ایسی مشکلوں میں گھر جائیں گے کہ اس ملک میں عزت کے ساتھ رہنا ہی ان کے لیے دشوار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے یا بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے، بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ نہیں ہونے والا ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابل بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور شرعی حکم یاد دلاتا ہوں جو بہت زیادہ اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس حکم کو قرآن کی زبان میں اضطرار کہا جاتا ہے۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں مطلق حرام ہے۔ لیکن ایک شخص اگر مضطر ہو جائے۔ یعنی وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے پاس جان بچانے کے لیے صرف خنزیر کا گوشت ہو۔ اس کے لیے دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ہو۔ یا تو وہ خنزیر کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے یا پھر بھوک سے مر جائے۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی کو خنزیر کا گوشت کھا لینا چاہیے۔ کیوں کہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آج یہی نازک مسئلہ انڈیا کے پورے مسلم گروہ کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر جو شریعت ایک جان کو بچانے کے لیے حرام غذا کو حلال کر دیتی ہے، وہ شریعت کیا بارہ کروڑ انسانوں کے ایک مسلم گروہ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے انھیں کوئی رعایت نہ دے گی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بابری مسجد کو بچانا مسلمانوں کی قومی ذمہ داری تھی، تب بھی موجودہ حالت میں یہ ذمہ داری ان سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اب خود شریعت کے حکم اضطرار کے تحت

ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ سے الگ ہو جائیں تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچا سکیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ما خُیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے)

اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچئے تو اس وقت مسلمانوں کے لیے دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کا موقع ہے۔ ایک یہ کہ بابری مسجد کے اشو سے خود کو الگ کر کے اس کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں۔ دوسرے یہ کہ بابری مسجد کے لیے وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ دونوں صورتوں کا تقابل کیجئے تو یقینی طور پر پہلی صورت آسان اور دوسری صورت انتہائی مشکل ہے۔ ایسی حالت میں عین سنتِ رسول کا تقاضا ہے کہ مسلمان آسان صورت کو اپنا لیں اور مشکل صورت کو چھوڑ دیں۔

اس روش کو اختیار کر کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں کریں گے۔ وہ وہی کریں گے جس پر وہ تقریباً پچاس سال سے اس ملک میں عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۴۷ میں پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مختلف طریقوں سے ان کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی ان مسجدوں کے نام پر کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں انھوں نے اپنے کو مضطر پایا تھا۔ اب اگر وہ بابری مسجد کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں تو یہ عین وہی ہوگا جس پر اس سے پہلے سے وہ عملاً قائم رہے ہیں۔

میں نے جو تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے وہ باعتبار حقیقت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں اسی اصول کو باعزت طور پر لاگو کرنا ہے جو عملاً ملک کی ہزاروں مسجدوں کے بارہ میں تمام علماء کی مرضی سے اختیار کیا جا چکا ہے۔

اس تین نکاتی فارمولے میں ایک طرف مسلمان مزید جان و مال کی ہلاکت سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فریق ثانی اس کے ذریعہ اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اجودھیا جیسے عمل کو ملک کی کسی اور مسجد کے ساتھ کبھی نہ دہرائے۔ تیسرے یہ کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنی

عبادت گاہوں کے لیے ایک محکم دستوری ضمانت مل جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا، اس فارمولے کا مقصد مسجد کے بارہ میں شرعی حکم کو بتانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی ذات کے اعتبار سے اس معاملہ میں ان کے لیے شریعت کا حکم کیا ہے۔

اس فارمولے کو مان کر اگر اس کی تعمیل کر دی جائے تو اس کا غیر معمولی فائدہ مسلمانوں کو اور پورے ملک کو ملے گا۔ اس کے بعد ملک میں امن قائم ہو جائے گا۔ نفرت اور تشدد کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح مسلمانوں کو اور دوسرے تمام طبقوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر میں پُر امن طور پر لگ سکیں۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر شروع کر دیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے۔ اس ملک کے تمام لوگوں کو سچی سمجھ دے تاکہ وہ اس ملک کو ایک ترقی یافتہ ملک بنا سکیں۔

نوٹ : ایک تقریر جو ۱۵ فروری ۱۹۹۲ کو دہلی میں کی گئی۔

اجودھیا کا مسئلہ

نئی دہلی کے ادارہ مرکز برائے پالیسی ریسرچ (Centre for Policy Research) کے ہال میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ملک کے ممتاز دانشور تقریباً چالیس کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد مسائل پر مذاکرہ کرنا تھا۔ اظہار خیال کی زبان انگریزی تھی۔ ذیل کی تقریر اسی موقع پر پیش کی گئی۔

آج کی اس میٹنگ کے لیے بحث کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد ہے۔ اس بحث کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ میں خاص طور پر اس پہلو پر کچھ باتیں عرض کروں گا کہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ پیش آنے کے بعد انڈیا میں سیکولرزم کا مستقبل کیا ہے۔

کچھ لوگ اس بارہ میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ مگر میں ذاتی طور پر اس بارہ میں پُرامید ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے اس ملک میں سیکولرزم کی اہمیت کو از سر نو ثابت شدہ بنایا ہے۔ وہ ملک کے سیکولر عناصر کو یہ موقع دے رہا ہے کہ وہ یہاں سیکولرزم کو مزید قوت کے ساتھ قائم کر سکیں۔

۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو واقعہ پیش آیا وہ تشدد کا واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر۔ مسجد تحریک کے علم برداروں نے محسوس کیا کہ وہ پُرامن طور پر اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔

مگر تشدد کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الٹا نتیجہ دینے والا (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ تشدد کرنے والا اپنے خیال کے مطابق، اپنے حریف کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے لحاظ سے تشدد خود صاحب تشدد کی نفی ہے۔ تشدد صاحب تشدد کی نظریاتی صداقت کی تردید ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر دراصل اس دن کی علامت ہے جب کہ مندر۔ مسجد تحریک اپنے آخری منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

اس واقعہ کے بعد سیکولرزم کی اہمیت از سر نو ثابت ہو گئی ہے۔ سیکولرزم کیا ہے۔ سیکولرزم کا

مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ اسٹیٹ کا نظام مشترک مادی مقاصد کی بنیاد پر چلایا جائے۔ اور غیر مشترک امور میں ریاست عدم تدخل (non-interference) کی پالیسی اختیار کرے۔

انڈیا ایک پلورل سوسائٹی ہے۔ اس لیے انڈیا کے لیے سیکولرزم ہی واحد درست آئیڈیالوجی ہے۔ اس ملک میں سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری جو بھی آئیڈیالوجی اختیار کی جائے گی وہ ریجنل آئیڈیالوجی یا سیکٹرین آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور ایسی کوئی آئیڈیالوجی کبھی عمومی سطح پر قابل قبول نہیں بن سکتی۔

سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی اختیار کی جائے گی وہ اپنی عین نیچر کے اعتبار سے اسی تشدد دانہ نوبت تک پہنچے گی جس کی ایک مثال ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو سامنے آئی ہے۔ تشدد کا مقصد موقف کی کمزوری کی تلافی ہوتا ہے۔ اصولی تائید کی کمی کو آدمی طاقت کے ذریعہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اس سے تشدد ظہور میں آتا ہے۔

۶ دسمبر نے یہ ثابت کیا ہے کہ سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی یہاں اپنائی جائے گی وہ اپنی محدود اپیل کی بنا پر آخر کار تشدد کا سہارا لے گی۔ اس طرح وہ باعتبار نتیجہ دیش کی شانتی کو بھنگ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہے جو اپنی وسیع اپیل کی بنا پر دیش میں شانتی کا سماج بنا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جنھوں نے ۶ دسمبر سے پہلے مندر۔ مسجد تحریک کا ساتھ دیا تھا، وہ اس کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد اب اس سے برات ظاہر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بنارس کے بیوپار منڈل اور لکھنؤ کے بیوپار منڈل نے پرزور طور پر کہا ہے کہ مذہب اور عقیدہ کے معاملہ کو سیاست سے باہر رکھنا چاہیے، حالانکہ اس سے پہلے یہ لوگ اس تحریک کے مددگار بنے ہوئے تھے۔

سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ انڈیا یا تو سیکولر انڈیا کے طور پر باقی رہے گا یا وہ سرے سے باقی ہی نہ رہے گا:

India will survive as a secular India or not at all.

یہی بات موجودہ وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے ان لفظوں میں کہی کہ ہمارا

ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اگر ہم نے سیکولرزم کا راستہ چھوڑ دیا :

The country will go to pieces if we leave the path of secularism.

یہ بات بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری ہر آئیڈیالوجی محدود آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور کوئی محدود آئیڈیالوجی کبھی نیشنل آئیڈیالوجی کا بدل نہیں بن سکتی۔

انڈیا میں اگرچہ ۷۵ فی صد لوگ سیکولر آئیڈیالوجی میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر کے واقعہ نے جو ذہنی انتشار پیدا کیا ہے اس کے بعد تمام لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں گویا کہ وہ کسی بند گلی میں آکر پھنس گئے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

میرا تین نکاتی فارمولا قوم کو اسی بند گلی سے نکالنے کی ایک کوشش ہے۔ تین نکاتی فارمولا خود کوئی منزل نہیں ہے البتہ وہ موجودہ بند گلی سے نکلنے کی طرف ایک واضح اور متعین آغاز ہے۔ اس فارمولے کو مان لینے کے بعد پھر ہمارے لیے وہ راستہ کھل جاتا ہے جس کی روشنی میں ہم دوبارہ تعمیر و ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کر سکیں۔ یہ فارمولا مختصر طور پر یہ ہے :

- مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں۔
- ہندو اپنے مندر۔ مسجد اندولن کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔
- گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔

یہ تین نکاتی فارمولا اعتراف حقیقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اب ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے انتخاب اِس اسٹرکچر اور اُس اسٹرکچر میں نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اسٹرکچر اور تباہی میں رہ گیا ہے۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہی تاریخ میں تبدیلی کا ذہن ترک کر دیں اور اس معاملہ میں ہمیشہ کے لیے حالت موجودہ (status quo) کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔

عبادت گاہوں کا تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ عین اسی اصول پر بنایا گیا تھا۔ فارمولا یہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ اس ایکٹ کے مدعا کو دستور ہند میں بنیادی شہری حقوق کی حیثیت سے شامل کر دے تاکہ وہ اس معاملہ میں طرفین کے لیے زیادہ پائدار قانونی ضمانت بن جائے۔

مذکورہ تین نکاتی فارمولے پر بمبئی کے انگریزی روزنامہ مڈڈے نے مارگ (MARG) نامی ایجنسی سے ایک سروے کرایا۔ اس سروے کی مفصل رپورٹ مڈڈے (۲ فروری ۱۹۹۳) اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ روزنامہ انقلاب (۲ فروری ۱۹۹۳) میں شائع شدہ رپورٹ کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

"مولانا وحید الدین خاں نے گزشتہ ہفتہ مسئلہ اجودھیا کو حل کرنے اور ملک میں فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کے سلسلہ میں جو سہ نکاتی منصوبہ پیش کیا ہے اسے بمبئی میں رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی اکثریت قابل قبول سمجھتی ہے۔ سنڈے انقلاب کے لیے یہ سروے مارگ نامی ایجنسی نے کیا ہے جو عوامی موڈ کا صحیح اندازہ لگانے میں خاصی مشہور ہے۔ اس رائے شماری پروگرام کے تحت ۵۱۷ ہندو مردوں اور عورتوں سے انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے ۶۹ فیصد نے اس منصوبہ کو منظور اور ۲۵ فیصد نے نامنظور کیا۔

۱۷۰ مسلم خواتین اور مردوں میں سے ۶۳ فیصد نے منصوبہ کے حق میں اور ۲۹ فیصد نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیے۔ جو لوگ واضح طور پر مولانا وحید الدین خاں کے منصوبہ کے حق میں نہیں ہیں انھوں نے بھی یہ پوچھے جانے پر کہ کیا یہ فارمولا آپسی بات چیت کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے "ہاں" میں جواب دیا۔ اس طرح انٹرویو کیے جانے والے افراد میں سے صرف ۵ فی صد ایسے تھے جنھوں نے مولانا کی تجویز کو سرے سے نامنظور کر دیا۔"

(انقلاب (بمبئی) ۷ فروری ۱۹۹۳)

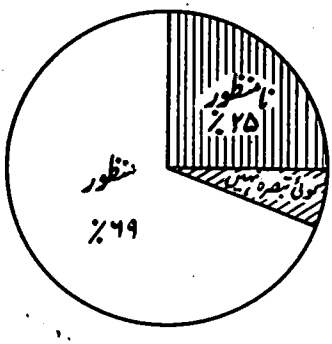

ہندو : ۱۰۰ فیصد

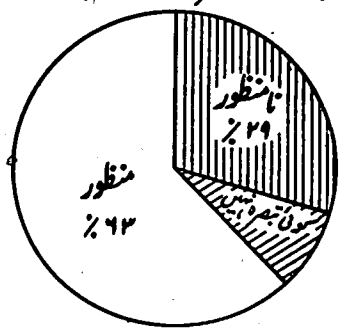

مسلمان : ۱۰۰ فیصد

اس کے علاوہ مختلف مقامات سے ہمیں اطلاعات مل رہی ہیں کہ لوگ بڑی تعداد میں اس فارمولے سے اتفاق کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک خط یہ ہے : یہ اصل خط ہندی میں ہے۔ یہاں اس کو اردو رسم خط میں نقل کیا جاتا ہے :

"بعد سلام کے آپ کی نئی زمین سمواد داتا سے بات چیت" نئی زمین" ۲۱ فروری سے ۲۷ فروری ۱۹۹۲ اخبار میں پڑھی۔ آپ کے تین سوتری فارمولا کے بارے میں جانکاری ملی۔ میں اس کا سمرتھن کرتا ہوں۔ یہاں ناگدا میں میں نے ناگدا کی جنتا سے موکھک سروے کیا۔ لگ بھگ سبھی لوگوں نے سمرتھن کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تین سوتری فارمولے پر ہستاکچھر ابھیان دیش بھر میں کرائیں۔ جس سے لوگوں کی رائے کا پتہ چلے۔ اگر آپ ہستاکچھر ابھیان شروع کر چکے ہیں تو ہمیں بھی جانکاری دیویں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ آج دیش بھر میں جو سامپردائک اُنماد پھیل رہا ہے اس میں آپ کا فارمولا جیون رکشک گھول کا کام کرے گا" (۲۶-۲-۱۹۹۲)

شجاع الدین اگوان - پترکار - ۱۰۱ جنم جے مارگ - ناگدا ۴۵۶۲۳۵

مسٹر کلدیپ نائر کا ایک مضمون ناگپور کے انگریزی روزنامہ ہیتاوادا (The Hitavada) کے شمارہ ۱۷ مارچ ۱۹۹۲ میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون اجودھیا کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ پچھلے دو مہینوں میں میں پورے ملک میں گھوما ہوں، اور میں اس تاثر کے ساتھ واپس آیا ہوں کہ مسلمان اس کے لیے راضی ہو جائیں گے کہ وہ بابری مسجد سے اپنا دعویٰ واپس لے لیں، بشرطیکہ اس کے بعد کسی اور مذہبی عمارت کے لیے مزید مانگ نہ کی جائے :

I have gone round the country in the last two months and I have come back with the impression that the Muslims may be willing to withdraw their claim on the Babri Masjid provided there are no further demands on other religous buildings. (p.8).

اجودھیا اور اس کے بعد

اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ آج پوری ملت اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسجد کے ڈھانچہ میں پتھروں کی جتنی تعداد ہوگی، اس سے بھی زیادہ تعداد میں مسلمان ملک کے مختلف حصوں میں اب تک مارے جا چکے ہیں۔ اور ہلاکت اور رسوائی کا یہ سلسلہ بظاہر لامتناہی طور پر جاری ہے۔

یہ مسجد بابر کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں تعمیر کی تھی۔ بعد کو اس کے سلسلہ میں کچھ نزاع پیدا ہوئی۔ تاہم ابتداءً اس کی حیثیت ایک معمولی مقامی مسئلہ کی تھی۔ آزادی کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ کی رات کو کچھ مقامی ہندوؤں نے مسجد کے اندر تین مورتیاں رکھ دیں۔ لیکن اب بھی اس نے خطرناک مسئلہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ کیوں کہ عدالت کے حکم سے جلد ہی مسجد کے دروازہ پر تالا لگا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یکم فروری ۱۹۸۶ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ انتظامی ذمہ داروں نے مسجد کا تالا کھول دیا اور مقامی ہندوؤں کو مورتیوں کے درشن اور پوجا کے لیے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے مسئلہ نے نیا رخ اختیار کر لیا۔

اب کچھ مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔ دوسری طرف کچھ ہندو لیڈروں نے رام مندر کا شوشہ لے کر شدید تر انداز میں اپنا اندولن جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے تحریکیں چلتی رہیں یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ حادثہ پیش آیا کہ ہندو انتہا پسند بڑی تعداد میں اجودھیا میں جمع ہوئے۔ اور انھوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر مکمل طور پر اسے ختم کر دیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر بنا دیا۔

اس واقعہ کے بعد پورے ملک کا ضمیر چیخ اٹھا ہے۔ ملک کے تمام باشعور لوگوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ بابری مسجد کو اس طرح ڈھانا دستور، قانون، عدالتی فیصلہ، مذہبی اور اخلاقی روایات نیز خود رام مندر تحریک کے لیڈروں کے اپنے اعلانات کے خلاف تھا۔ یہ محض سادہ طور پر ایک عمارت کو ڈھانے کا واقعہ نہ رہا بلکہ وہ پوری ایک تاریخ کو ڈھانے کا واقعہ بن گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے ۶ دسمبر کے واقعہ کو ایک قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔ مسٹر جے ایس یادو (ہندستان ٹائمس ۲ جنوری ۱۹۹۳) کے الفاظ میں، اب خود ملک کا وجود و بقا داؤ پر لگا ہوا ہے :

The very survival of our nation is at stake.

غیر گاندھیائی طریقہ

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۱ میں انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی (civil disobedience) کی تحریک چلائی۔ ان کا اعلان تھا کہ یہ تحریک مکمل طور پر اہنسا کے اصول پر چلے گی۔ اس کے دوران کسی کے خلاف کسی بھی قسم کا تشدد نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ۵ فروری کو کانگریس کمیٹی کے لوگوں نے چورا چوری میں وہاں کے تھانہ کو آگ لگا دی۔ اس میں کچھ کانسٹبل جل کر مر گئے۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس واقعہ کو ہمالیائی غلطی (Himalayan blunder) بتایا اور فوراً تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں سخت تر انداز میں تشدد کا واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس تحریک کے لیڈروں نے اپنی مندر۔ مسجد تحریک کے خاتمہ کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان کے انتہا پسند عناصر بلا روک یہ کہہ رہے ہیں کہ : اجودھیا تو جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔

یہ بلاشبہ قوم کے باپو مہاتما گاندھی کے مسلمہ طریقہ کے خلاف ہے۔ اور یہ غیر گاندھیائی طریقہ ملک کو کامل تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ اجودھیا کی غلطی کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ اب اس قسم کی بولی بولنا مکمل طور پر بند کیا جائے۔ اور یہ عہد کیا جائے کہ اس قسم کا عمل اب کہیں اور کبھی ہرگز نہیں دہرایا جائے گا۔

متھرا کی مسجد

متھرا میں ایک بڑی مسجد ہے۔ اس کو اورنگ زیب نے ۱۶۶۹ء میں بنوایا تھا۔ عام طور پر یہ پروپگنڈا کیا گیا ہے کہ یہ مسجد شری کرشن کے جنم استھان پر بنائی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو توڑ کر وہاں شری کرشن کا مندر تعمیر کیا جائے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے میں خود ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کو دہلی سے متھرا گیا۔ وہاں میں نے کئی

ہندو دوستوں کے ساتھ اس کو مکمل طور پر دیکھا۔ متھرا کے کچھ واقف کار ہندوؤں اور مسلمانوں سے اس کے بارہ میں گفت گو بھی کی۔

میں نے دیکھا کہ وہاں ایک طرف ایک خوب صورت مسجد ہے۔ اگرچہ اس کا راستہ زیادہ اچھا نہیں۔ دوسری طرف مندر کا وسیع اور عظیم کامپلکس ہے جس کو شری کرشن کا جنم استھان کہا جاتا ہے۔ اجودھیا کے تجربہ کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ شری کرشن کا جنم استھان غالباً کسی متنازعہ زمین پر مسجد کے اندرونی حصہ میں واقع ہے۔ اور اسی لیے اس کی مانگ کی جارہی ہے۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

ہم لوگ مندر کے مختلف حصوں کو دیکھتے ہوئے ایک خاص کمرہ میں پہنچے۔ یہاں ایک سجائے ہوئے چبوترہ پر شری کرشن کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی دوسری متعلق چیزیں آس پاس موجود تھیں۔ بتایا گیا کہ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں شری کرشن نے جنم لیا تھا۔ یہ جگہ پوری طرح مندر کے احاطہ میں تھی۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر ایک ہندو بھائی نے کہا: متھرا کو اجودھیا کی کیٹگری میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ کرشن کا جنم استھان تو مندر کے اندر ہے، وہ مسجد میں شامل نہیں۔

کوئی بھی شخص متھرا جاکر اس واقعہ کو دیکھ سکتا ہے۔ جب شری کرشن کے جنم کی جگہ عملاً مندر کے احاطہ میں ہے تو اس کے لیے مسجد کی مانگ کیوں کی جاتی ہے جو اس سے باہر الگ زمین پر واقع ہے۔ اگر اجودھیا کی مسجد کے خلاف تحریک کا جواز یہ تھا کہ وہ شری رام کے جنم کی جگہ پر بنی ہے تو متھرا کی مسجد کی مانگ کا جواز کیا ہوگا جو واضح طور پر شری کرشن کے جنم استھان سے باہر بنائی گئی ہے۔

مزید یہ کہ متھرا کے مسئلہ میں مبینہ طور پر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقریباً چالیس سال پہلے ایک راضی نامہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر نزاع ہوئی۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ آخر کار ۱۹۶۸ میں متھرا کے کئی بزرگوں کی کوشش سے، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، دونوں فریقوں کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے مطابق، مسلمانوں نے مسجد کے پاس کی موقوفہ زمین کا بڑا حصہ ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔ اس زمین پر شری کرشن مندر کا بہت بڑا کامپلکس تعمیر کیا جا چکا ہے۔ ایسی حالت میں ایک طے شدہ معاملہ کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس کے دعوے داروں کے پاس کیا جواز ہے۔

ایک رپورٹ

اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں کئی معلوماتی رپورٹیں چھپ چکی ہیں۔ انھیں میں سے ایک رپورٹ مدراس کے انگریزی میگزین فرنٹ لائن (Frontline) کی ہے۔ یہ اس کے شمارہ ۲۹ جنوری ۱۹۹۳ کی کور اسٹوری ہے جس کا عنوان ہے کیسری انتہا پسند (Saffron Extremism)

میگزین کے رپورٹر وینکٹیش راما کرشنن (Venkitesh Ramakrishan) نے متھرا جا کر وہاں جو براہ راست معلومات حاصل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں کرشن جنم استھان ٹرسٹ اور عیدگاہ مسجد ٹرسٹ کے درمیان عرصہ سے مقدمات جاری تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۴ میں دونوں فریقوں نے باہمی رضامندی سے ایک تحریری معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں کئی مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہاتھ تھا۔ مثلاً دیودھر شاستری وغیرہ۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں بھی اس میں شامل رہی ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق، دونوں کی زمینی حد بندی کر دی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ مسجد اور مندر دونوں آس پاس قائم رہیں گے۔ رپورٹر نے اس سلسلہ میں مختلف مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں، رپورٹ کے مطابق، ہندوؤں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی نزاع نہیں۔ عام ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ہر بات طے ہو چکی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی، ہر ایک کو اجازت ہے کہ وہ یہاں آئے اور اپنی عبادت کرے۔ ہم کیوں لوگوں کو الگ کرنے کی کوشش کریں اور نئے مسائل پیدا کریں۔ بابو لال شلپی، جو کرشن جنم بھومی کی تعمیرات میں شریک رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ وہ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہر بات ۱۹۶۸ میں طے ہو گئی تھی۔ گربھ گریہ ہم کو مل چکا ہے۔ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی یہ کام باتیں صرف سیاست ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں:

And a majority of Hindus believe that there is no dispute. "Everything has been settled. Everybody, Hindus, Christians, Sikhs and Muslims, is permitted entry and the right to worship. Why should we try to segregate and create new problems?" is the general response. Babulal Shilpi, who has been involved in the construction of the various shrines at Krishna janamabhoomi, said he did not see the need to displace the idgah (masjid). "Everything was settled in 1968. We have got the garbha griha (sanctum sanctorum). All this talk about displacing the idgah (masjid) is politics. I have no concern for that (p.17).

بنارس کی مسجد

اب بنارس (کاشی) کے معاملہ کو لیجئے۔ مندر۔مسجد تحریک کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہاں گیان واپی کے نام سے جو مسجد ہے، اس کو اورنگ زیب نے ایک مندر کو توڑ کر بنایا تھا۔ اس لیے اب ہم اس کو ختم کریں گے اور اس کی جگہ پر دوبارہ ایک مندر کی تعمیر کریں گے۔ اپنے اس منصوبہ کو وہ لوگ "تاریخ کی تصحیح" کا نام دیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ بنارس کی مذکورہ مسجد کے بارہ میں یہ دعوی صحیح ہے یا غلط، تاریخ کی تصحیح کا یہ نظریہ آج عالمی سطح پر رد کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظریہ درحقیقت مذہبی تعذیب (religious persecution) کے اس دور کو نئے نام کے ساتھ واپس لانا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں صرف دور وحشت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فناٹزم ہے نہ کہ فی الواقع تاریخ کی تصحیح۔

ناگپور کے ایک بودھ دانشور ڈاکٹر ویمل کیرتی (Dr. Vimal Kirti) نے بجا طور پر کہا ہے کہ جو ہندو صاحبان آج تاریخ کی تصحیح کی بات کرتے ہیں، کیا وہ اپنے اس نظریہ کو تاریخ میں اور پیچھے تک لے جائیں گے۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ خود ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے جو وہ دوسروں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ہندو صاحبان جس چیز کا الزام اورنگ زیب کو دے رہے ہیں، وہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر خود انھوں نے بھی انڈیا کے بودھوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ چھٹی صدی عیسوی اور ساتویں صدی عیسوی میں بھارت کے برہمنوں نے اس وقت کے راجاؤں کی مدد سے بدھوں کے خلاف سخت تعذیبی اقدامات کیے۔ انھوں نے بہت سے بودھ عبادت خانے توڑ ڈالے اور ان کی جگہ ہندو مندر بنا دیا:

From time to time Hindus, especially Saivites, took aggressive action against Buddhism. At least two Saivite kings - the Huna invader Mihirakula (early 6th century) and the Bengal King Sasanka (early 7th century) - are reported to have been active persecutors, destroying monasteries and killing monks (8/914).

عبادت خانوں کو توڑنے کے واقعات اس گزرے ہوئے زمانہ میں پیش آئے جب کہ

دنیا میں مذہبی تعذیب (religious persecution) کا عام رواج تھا۔ اب وہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی بات کرنا ایک سنگین قسم کی خلافِ زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اس تحریک کے علم برداروں کو جاننا چاہیے کہ یہاں زمانی عامل (age-factor) ان کی راہ میں حائل ہے۔ جو لوگ ایسا کام کرنے کے لیے اٹھیں، ان کو زمانہ ہمیشہ رد کر دیتا ہے۔ دنیا ان کو رجعت پسند قرار دے کر انھیں پیچھے کی صف میں دھکیل دیتی ہے۔

اس انجام سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ باہر کی دنیا میں صفائی پیش کرنے والے وفود بھیجے جائیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ ایسا کام ہی نہ کیا جائے جو زمانہ کے مسلّمہ معیار کے خلاف ہو۔ جو زمانہ کی نظر میں اپنے آپ کو حقیر بنا دینے والا ہو۔

قدیم زمانہ میں مذکورہ قسم کے واقعات ہر جگہ پیش آئے ہیں۔ اس لیے اگر تصحیح تاریخ کے اس اصول کو اختیار کیا جائے تو وہ کسی ایک گروہ پر نہیں رکے گا بلکہ وہ ہر گروہ تک جا پہنچے گا۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ تاریخ کی تصحیح نہیں ہوگی بلکہ صرف تاریخ کی تخریب ہوگی۔ یہ ماضی کو لینے کے نام پر حال کو کھو دینا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے علم برداروں کے لیے یہاں انتخاب دوبارہ مسجد اور تصحیح تاریخ میں نہیں ہے، بلکہ مسجد اور مکمل تباہی میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالمی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ اس طرح کے نزاعی معاملات میں ماضی کے بند ابواب کو نہ کھولا جائے۔ بلکہ حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت طور پر قومی تعمیر کا کام جاری رکھا جائے۔

فرنٹ لائن کا جائزہ

ہفت روزہ فرنٹ لائن کے رپورٹر وینکٹیش رامکرشنن نے بنارس جا کر اس معاملہ کی تحقیق کی ہے۔ فرنٹ لائن کے شمارہ (۲۹ جنوری ۱۹۹۲) میں اس کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اجودھیا کی طرح متھرا اور بنارس میں بھی جھگڑے کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ صرف افسانہ پر مبنی ہے :

As at Ayodhya, the "disputes" at Mathura and Varanasi have their basis in myths (p.12).

انھوں نے لکھا ہے کہ ہندو تو کے علم بردار یہ کہتے ہیں کہ گیان واپی مسجد جو کہ کاشی وشوناتھ مندر کے پاس ہے، اس کو ایک مندر کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔ مگر اس دعوے کے حق میں ان کے پاس کوئی واضح ثبوت (clear proof) موجود نہیں۔ حتی کہ اس سلسلہ میں مہنت لوگوں کے بیانات بھی یکساں نہیں۔ مختلف مہنت مختلف بات کہتے ہیں۔ مثلاً پنڈت رام شنکر ترپاٹھی کہتے ہیں کہ اصل مندر رضیہ بیگم کی مسجد کی جگہ تھا۔ جو کہ گیان واپی مسجد سے دو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پنڈت کیلاش پتی تیواری گیان واپی مسجد ہی کو قدیم مندر کا اصل مقام بتاتے ہیں، مگر ان کے پاس اس کا کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں۔ کچھ اور مہنت یہ کہتے ہیں کہ اصل وشوناتھ مندر وشیشور گنج میں تھا۔ یہ مقام بھی گیان واپی مسجد سے دو کیلو میٹر دور ہے۔ اور بھی کئی رائیں ہیں۔ مگر تاریخی دستاویزات (historical records) کسی کے پاس بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گیان واپی مسجد کی جگہ ایک وشوناتھ مندر تھا۔ اورنگ زیب نے اس کو ڈھا کر ۱۶۶۹ میں یہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بنارس کے سنتوں اور پنڈتوں سے اس مغل بادشاہ کے اچھے تعلقات تھے۔ ایسی حالت میں اس نے مندر کو کیوں ڈھایا (صفحہ ۱۴)

مزید یہ کہ موجودہ وشوناتھ مندر کو اندور کی مہارانی اہلیا بائی ہولکر نے ۱۷۷۷ میں بنوایا تھا۔ اس وقت ایک تجویز یہ تھی کہ گیان واپی مسجد کو ڈھا دیا جائے۔ مہارانی نے بنارس کے پنڈتوں سے رائے لی۔ لوک پتی ترپاٹھی کے بیان کے مطابق، پنڈتوں نے اس کی مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک کسی دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ کو ڈھا کر وہاں مندر نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ یہ تجویز ختم ہو گئی :

The temple was rebuilt by the Maharani of Indore, Ahalya Bai Holkar, in 1777. Then there was a suggestion to demolish the Gyanvapi Mosque, and the Maharani consulted the pandits of Varanasi. According to Lokpati Tripathi, Congress (I) leader, the pandits were against this, for, according to them, a mandir could not be built by demolishing another community's place of worship. this put an end to the move. (14).

اقتصادی نقصان

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو لوگ بابری مسجد کو ڈھا رہے تھے، وہ اپنے خیال کے مطابق، پتھر کے ایک قدیم ڈھانچہ کو ڈھا رہے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے انھوں نے ملک کے پورے اقتصادی ڈھانچہ

کو ڈھا دیا۔ اس سلسلہ میں مختلف رپورٹیں اخباروں میں آتی رہی ہیں۔ مثلاً ۶ دسمبر کے بعد دیش میں جو گڑبڑ ہوئی، اس کی وجہ سے صرف دسمبر ۱۹۹۲ اور جنوری ۱۹۹۳ میں گورنمنٹ کے کسٹم اور اکسائز ڈیوٹی کی وصولیابی میں ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ فسادات کے نتیجہ میں اکثر بڑے بڑے شہروں میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر جو نقصان ہوا، اس کی مقدار اربوں روپیہ تک جاتی ہے۔ باہر کے انوسٹ منٹ میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ حتیٰ کہ متعدد بیرونی تجارتی ادارے اپنا کاروبار بند کر کے ہندستان سے واپس چلے گئے۔

ٹائمس آف انڈیا (۸ فروری ۱۹۹۳) نے اس سلسلہ میں ایک جامع سروے شائع کیا ہے جس کو اگلے صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق، ملک بھر کا تجارتی طبقہ مندر۔ مسجد سیاست سے گھبرا اٹھا ہے۔ کیوں کہ اس کا اقتصادی نقصان ناقابل برداشت حد تک زیادہ ہے۔ صرف بمبئی کے فسادات میں جو نقصان ہوا، اس کا اندازہ تقریباً دو ہزار کرور ہے۔ احمد آباد اور سورت میں یہ نقصان تین ہزار کرور روپیہ تک پہنچ گیا۔ یہ مقدار بھی براہ راست نقصان کی ہے۔ بالواسطہ نقصان اس اندازہ میں شامل نہیں۔

جے پور میں فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں دو ہزار کرور روپیہ کا نقصان ہوا۔ راج کوٹ میونسپل کارپوریشن میں ہر روز پانچ لاکھ روپیہ چنگی کی رقم آتی تھی۔ مگر دسمبر میں وہ ۷۵ ہزار روپیہ روزانہ تک گر گئی۔ لکھنؤ کے تاجروں کو اس دوران پانچ سو کرور روپیہ کا نقصان پہنچا۔ اتر پردیش کے تاجروں کا خیال ہے کہ ریاست کی اقتصادیات دس سال پیچھے چلی گئی ہے۔ وغیرہ۔

ہندو۔ ہندو مسئلہ

اس سلسلہ میں کاشی بیوپار منڈل کا فیصلہ قابل ذکر ہے جو بتاتا ہے کہ اجودھیا کے تجربہ کو بنارس میں دہرانا اپنے اندر ایک سنگین خطرہ لیے ہوئے ہے۔ یہ ہندو مسلم مسئلہ میں مزید اضافہ کر کے اس کو ہندو ہندو مسئلہ بنا دینے کے ہم معنی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہندوؤں کا تاجر طبقہ مبینہ طور پر اس کے خلاف ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں مسٹر ویویک بھارتی (Vivek Bharati) کا مضمون (شائع شدہ ٹائمس آف انڈیا ۶ جنوری ۱۹۹۳) اس تحریک کے علم برداروں کے لیے ایک چیتاونی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا

دوسطری عنوان انھوں نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے :

Lessons Of Varanasi
Pitting Economy Against Hindutva

اس مضمون کا ایک حصہ صفحہ کے نیچے درج کیا جارہا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں نے اب جان لیا ہے کہ اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک ایک تخریبی تحریک تھی۔ اس کا ایک مظاہرہ بنارس میں سامنے آیا ہے ۔ بنارس میں تقریباً پانچ لاکھ تاجروں کی طاقت ور کمیونیٹی ہے ۔ ان کی تنظیم کا نام کاشی بیوپار منڈل ہے ۔ اس تنظیم کے ہندو تاجروں نے اس سے پہلے بی جے پی کو کافی مالی تعاون دیا تھا۔

لیکن ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ بابری مسجد کے فاتح بنارس کی گیان واپی مسجد کا رخ کرنے والے ہیں تو کاشی بیوپار منڈل فوراً اس کے خلاف حرکت میں آگیا۔ اس نے بنارس کے پانچ لاکھ تاجروں کے نام پُرزور اپیل جاری کی جس میں کہا گیا تھا کہ بنارس کے تمام تاجر مندر اور مسجد کی

As the communal violence unleashed by the Ayodhya tragedy hit the headlines, the numerous instances from all over the country of people from both the communities joining hands to resist the destructive onslaught of communalism were relegated to the background. One such spontaneous mass action preaching peace and sanity in the historic city of Varanasi is particularly noteworthy. Sensing that the "conquerors" of Babri Masjid have a similar design for the Gyanvapi mosque at Varanasi, the city's traders' association, the Kashi Vyapar Mandal, issued a strong appeal to the five-lakh strong trader community comprising both Hindus and Muslims to stay away from the politics of Mandirs and Masjids and followed it up by organizing peace marches. Ironically, the Hindu members of the Vyapar Mandal have supported the BJP in the past and even mobilised donations for the kar sevaks who ran amok at Ayodhya. The issue is not whether these erstwhile supporters of the BJP have suddenly turned secular but that they have found it necessary to maintain peaceful co-existence. If Varanasi goes the Ayodhya way, the traders would be the worst hit as lawlessness and killings would drive away thousands of tourists who flock to this temple city and also kill a flourishing business in carpets and sarees which caters to both the home and export markets. Since both Muslims and Hindus are equally dependent on this commerce, it is plain that economic interests have prevailed over political or communal prejudices. This should send a clear signal that a powerful economic agenda has to be a major plank in the fight against communalism. Over the last two decades India has lost the race of development and its status in the world. A large number of countries which were poorer than us have passed us by and it is not India but China which is emerging as the new economic giant. It is time to spread the message of Varanasi that communalism can only disrupt and destroy and prevent us from seizing the last chance we have of recharging our economic system and retrieving our national pride. It is time to spread the message of Kautilya that "of the three ends of human life, material gain is, verily, the most important." On material gain depends the realization of dharma and pleasure. (*The Times of India*, January 6, 1993)

سیاست سے الگ رہیں۔ اسی کے ساتھ کاشی بچاؤ منڈل نے شہر میں شانتی مارچ بھی کیے۔

اس کی وجہ تجارتی نقصان کا اندیشہ ہے۔ بنارس کے تاجروں نے محسوس کیا کہ ان کی تجارت قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اجودھیا جیسی تحریک بنارس میں داخل نہ ہو۔ اگر یہ تحریک بنارس پہنچتی ہے تو اس کے بعد جو لاقانونیت اور دنگا ہوگا اس میں سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ کا ہوگا۔ ایسی حالت میں کاروبار ٹھپ ہوگا اور ان سیاحوں کی آمد رک جائے گی جو ہزاروں کی تعداد میں مسلسل بنارس آتے ہیں اور جن کی وجہ سے بنارس میں قالینوں اور ساڑیوں کا نفع بخش بزنس چل رہا ہے۔ یہی اقتصادی مسئلہ متھرا میں بھی پیش آیا ہے (ملاحظہ ہو فرنٹ لائن، ۲۹ جنوری ۱۹۹۲)

بنارس کے اس تجربہ کو آج پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دیش کے لوگوں کو بتایا جائے کہ اس قسم کی تحریکیں چلانا گویا نان اشو کو اشو بنانا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں انڈیا ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہوگیا ہے۔ اور دنیا میں اس نے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ بہت سے ملک جو ہم سے زیادہ غریب تھے، وہ ہم سے آگے بڑھ گئے۔ مثلاً چین، کوریا اور سنگاپور۔ ضرورت ہے کہ دیش کی تعمیر کے لیے مذہب کے بجائے اقتصادیات کو اشو بنایا جائے۔

مسئلہ کی سنگینی

اس مسئلہ کی سنگینی، نتائج کے اعتبار سے اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف انڈیا میں بلکہ ساری دنیا میں اس پر تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہاں میں بطور نمونہ ایک انگریزی میگزین ایشیا ویک کا حوالہ دوں گا۔ یہ ہانگ کانگ سے نکلتا ہے اور ٹائم گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایشیا ویک نے اپنے شمارہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کے ایڈیٹوریل کا عنوان یہ بنایا ہے ـــــ ایک خطرناک گھاٹی (A dangerous pass) اس میں اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایشیا کو اجودھیا کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے :

Asia may have to pay heavy price for Ayodhya

ایشیا ویک نے موجودہ تحریک کو ہندو فسطائیت (Hindu fascism) قرار دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ تحریک اگر اپنی منطقی حد (logical extreme) تک پہنچ گئی تو انڈیا کو اس کی ہولناک قیمت (terrible price) چکانی پڑے گی جس کا تحمل انڈیا نہ کر سکے گا جہاں ۵۰۰ ملین

آدمی افلاس کا شکار ہیں۔ اور ۷۰ فی صد آدمی اب بھی بے پڑھے لکھے ہیں۔

ایسی حالت میں انتہائی طور پر ضروری ہے کہ مندر۔ مسجد کی اس نزاع کو بلا تاخیر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اسی میں ہندو کا بھی فائدہ ہے، اسی میں مسلمان کا بھی فائدہ۔ اور اسی کے ذریعہ دیش کو ترقی کی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔

مانع اسباب

انسانی جسم میں خون سخت پریشر کے ساتھ دوڑتا ہے۔ اس لیے اگر جسم میں کوئی زخم آجائے تو خون فوراً بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک خطرہ کی صورت حال ہے۔ مگر جسم کے اندر ایک فطری نظام (Natural mechanism) کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ جب زخم کی وجہ سے خون نکلنا شروع ہوتا ہے تو فوراً ہی جسم کے اندر کئی مانع اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو خون کے بہاؤ کو روک دیتے ہیں۔ مثلاً رگوں کا سکڑنا، خون میں کلاٹ بننا (blood clotting) وغیرہ۔ اس فطری نظام کو ہیموا سٹاسس (hemostasis) کہا جاتا ہے۔ (IV/1015)

یہ ایک آفاقی قانون ہے جو حادثہ کی ہر صورت حال میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی تخریب کی کارروائی وقوع میں آتی ہے تو عین اسی وقت کچھ مانع طاقتیں (deterrent forces) پیدا ہو جاتی ہیں جو اس تخریبی عمل کو روکنے کے لیے اس کے خلاف سرگرم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی سماج میں کوئی تخریبی عمل صرف کچھ دیر جاری رہتا ہے اور پھر اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ یہ فطری عمل اجودھیا کے معاملہ میں بھی پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ انتہا پسند لیڈر چاہیں یا نہ چاہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ مانع طاقتیں اس حد تک ظاہر ہو چکی ہیں کہ اب انھوں نے اس طرح کے حادثہ کے دوبارہ ظہور کے امکان کو سرے سے ختم کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ انتہا پسند لیڈر اپنی تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیں تو یہ عین ان کے حق میں ہوگا۔ اس کے بعد وہ ایک ایسے عمل کا کریڈٹ پالیں گے جس کے لیے وہ مشکل ہی سے مستحق قرار دیے جا سکتے ہیں۔

اخبار اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر مسٹر جے این نان پوریا کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے

BUSINESSMEN AGAINST MANDIR-MASJID POLITICS

Having suffered enormous losses in the wave of communal violence after the Ayodhya episode, businessmen and traders all over the country are perturbed about the growing communal divide and lawlessness.

A *Times of India* survey of the business community in major urban centres reveals that it desperately yearns for peaceful resolution of divisive conflicts and is fairly united in its opposition to politics of communalism and the increasing proclivity of political parties to mix religion with politics.

The near-unanimous condemnation by businessmen of the political forces and practices which have disrupted normal life in the country is understandable considering the hefty losses inflicted by riots in production and distribution of goods and destruction of property.

Losses in Bombay alone are estimated at about Rs. 2,000 crores caused by the disruption in trade and production and destruction of property and goods. In Ahmedabad and Surat, these are expected to be in the region of Rs 3,000 crores. However, since the entire industrial belt stretching from Bombay to Surat and Ahmedabad has strong bonds of interdependence across the country, these estimates represent only part of the loss inflicted by communal violence.

SAURASHTRA CALM: The Saurashtra region for instance, barring a few stray incidents remained calm and quiet. Yet rioting in Bombay and Ahmedabad disrupted both trade and manufacturing. As a director of the Rajkot engineering association, Mr. Vajubhai Mavani said: 'with Bombay shut, it was just impossible to send goods there. And with Ahmedabad in a state of disarray, there was no way of getting either raw materials or sending goods.'

A measure of the loss is provided by the Rajkot municipal corporation's income from octroi which in normal times averaged Rs. 5 lakh's a day. In the week after the Ayodhya episode it dipped to a measly Rs 75,000 per day. According to one estimate Gujarat as a whole may have suffered unprecedented losses worth nearly Rs. 12,000 crores spread across most sectors of trade and manufacturing like textiles, engineering, and industrial raw materials.

The impact of Bombay and Gujarat spread right across the Malwa region of Madhya Pradesh which has major industrial estates at Indore, Pithampur, Dewas and Ujjain. Trade and transport operations were also hit hard affecting truckers and merchants and manufacturers dealing in textiles, bullion and engineering goods.

Karnataka could not remain unaffected either. According to the President of the Federation of Karnataka chamber of commerce and industry, the state lost over Rs 100 cores as the entire mercantile activity was affected for a couple of weeks because of problems arising from riots in Bombay. Trucks remained off the roads, goods either kept piling up in factories or were stuck in Bombay and raw materials were in short supply. The leather industry, garment manufacturers and chemicals and automobile traders were the worst hit.

The communal violence in Jaipur inflicted losses worth about Rs. 200 crores, claims Mr. K.L. Jain, general secretary of the Rajasthan chamber of commerce and industry. Apart from he small-scale sector and the export-oriented gems and jewellery industry, riots had a severe impact on small shopkeepers, tea-stall owners and kiosks selling pan and cigarettes.

Lucknow is another state capital where local businessmen suffered losses exceeding Rs. 500 crores. What worries them even more is a sense of uncertainty about the future as they apprehend another round of violence if the prevailing communal tension in the city and adjoining areas like Ayodhya and Kanpur is allowed to persist. Mr AK Aggarwal, executive director of Indian industries association says.' 'If the situation is allowed to remain like this the state's economy will be hit hard.' According to Mr Banwari Lal Kanchchal, general secretary, Lucknow Vyapar Mandal, the economy of the state has already been pushed back by about 10 years.

FEAR OF VIOLENCE: The fears of future violence have motivated businessmen to speak up against politics of communalism. Mr Sandeep Bansal, president of Lucknow's Yuva Vyapar Mandal and an active member of the BJP says that all political parties should desist from taking those steps which militate against interests of trade and business and that communal co-existence is necessary for the all-round development of the state.

This view is articulated more sharply in Bangalore where all the businessmen and traders who spoke to *The Times of India* are vehemently opposed to the politics of communalism. Mr Abdus Subhan, a shopkeeper in Russel market bemoaned that politicians were exploiting issues like Ayodhya for their selfish ends and this kind of politicking must stop.

POLITICAL ISSUE: Likewise most traders in Bhopal do not see Ayodhya as a religious issue. Mr. Ajay Kumar, who runs a general store says 'It is clear that this is nothing but politics. Who cares about religion. Politicians are only interested in Ayodhya because it means votes on either side.

Businessmen and traders across the country are fairly united in advocating that religious issues must be kept out of politics and all cases of disputes should be resolved peacefully and within the parameters laid down by the Constitution. The president of Karanataka Small Industries Association, Mr D.N. Gangadhar argues that religion is a purely individualistic subject and politicians should not meddle with it and the secularism means that religion and politics are kept apart. Mr. Bimal Poddar, branch manager of Caprihans India in Ahmedabad, blames all political parties for making a mess of the Ayodhya issue, which he contends should be settled in a constitutional manner.

CENTRE'S FAILURE: Most traders and businessmen are also critical of the government's failure in checking communal riots and the breakdown of the law and order machinery. Mr Satish Chandra Patel, a small engineering goods' seller in Indore says good governance means that the politician-police-criminal nexus should be broken.

It is not just the prospect of losses that makes businessmen wary of communalism but the fact that it is unsustainable as in most manufacturing and trading activities both Hindus and Muslims form a complex web of interdependence which is critical to the very survival of business.

In the gems and jewellery industry of Jaipur for instance, while a majority of traders are Hindus, the cutting, polishing and packaging work is done mostly by Muslims. Likewise the powerloom sector in Gujarat is dependent on workmen from both the communities. The same situation obtains in most other places from Bombay to Bhopal and Indore to Lucknow. As the BJP activist in Lucknow, Mr Sandeep Bansal puts it, 'The people of the two communities are so dependent on each other that their co-existence is necessary for the prosperity of trade and industry.'

(The Times of India, February 8, 1993)

جو انھوں نے روزنامہ پانیر (۲۰ جنوری ۱۹۹۲) میں شائع کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بی جے پی اپنے سیاسی مقصد کو ہندُتو کے لفظ سے ظاہر کرتی ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس نے تمام تر فرقہ وارانہ جذبات (communal feeling) کو ابھارنے پر انحصار کیا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ جذبات کی ایک حد ہے۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ بی جے پی کے لیے وہ آخری حد اب آگئی۔ وہ ہندتو جس کو یہ انتہا پسند لیڈر پیش کرتے ہیں وہ ۶ دسمبر کو اپنی خطرناک حدوں پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید قابل استعمال نہیں :

Hindutva as interpreted by the hardliners reached its dangerous limits on December 6 and is no longer exploitable. (N.J. Nanporia)

تمام سنجیدہ لوگوں کی اس خواہش میں میں شریک ہوں کہ اس معاملہ کو اب باضابطہ طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔ ذاتی طور پر میں اس مسئلہ کے ساتھ ۱۹۸۶ سے برابر وابستہ رہا ہوں۔ اب کافی غور و خوض اور طرفین سے تبادلۂ خیال کے بعد اس کا ایک حل سامنے آیا ہے۔ یہ حل تین نکات پر مشتمل ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہی اس مسئلہ کے حل کی واحد ممکن تدبیر ہے۔ اور وہ یقیناً تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

تین نکاتی فارمولا

اجودھیا یا مندر۔ مسجد کے قضیہ میں تین فریق ہیں ——— ہندو، مسلمان اور گورنمنٹ۔ تینوں فریق اگر مندرجہ ذیل اصول پر اپنی اپنی ذمہ داری ادا کریں تو انشاء اللہ یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔

۱۔ ہندوؤں نے مندر اور مسجد کے نام پر جو اندولن چلایا، اس کو اب وہ اجودھیا ہی میں اسٹاپ کر دیں۔ کسی حال میں بھی وہ اس کو اجودھیا سے آگے نہ لے جائیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک تحریری اعلان نامہ (declaration) جاری ہو جس میں چاروں شنکراچاریہ، اور مندر۔ مسجد تحریک میں شامل تمام ہندو جماعتوں (بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس، بجرنگ دل) کے ذمہ دار افراد اپنا دستخط کریں۔ اس میں واضح لفظوں میں یہ اقرار کیا گیا ہو کہ ہندو صاحبان اجودھیا کی بابری مسجد کے بعد اب کسی اور مسجد کے لیے اس قسم کا سوال کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ بھارت کی بقیہ تمام مسجدیں، خواہ کسی شخص کے نزدیک ان کی جو بھی تاریخی

نوعیت ہو، وہ ہمیشہ کے لیے مقدس مسجد کی حیثیت سے باقی رہیں گی۔ ہندو صاحبان کی طرف سے آئندہ ان میں کسی بھی تبدیلی کی مانگ نہیں کی جائے گی۔

۲۔ مسلمان اب اجودھیا کے اشو پر بالکل چپ ہو جائیں۔ بابری مسجد کی حفاظت اگر ان کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جاکر ادا کر چکے ہیں۔ اب اس معاملہ میں وہ معذور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے مسلمان شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیں کہ اب وہ عملاً اس مسئلہ سے مکمل طور پر الگ ہو جائیں گے۔ اب تک انھوں نے خود اس مسئلہ کو اٹھا رکھا تھا۔ اب وہ اس کو چھوڑ کر اس مسئلہ کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں گے۔

۳۔ حکومت ہند نے ۱۹۹۱ میں عبادت گاہوں کا قانون (Places of Worship Act 1991) منظور کیا ہے۔ جو عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق ہے۔ اس میں یہ قانونی ضمانت دی گئی ہے کہ تمام عبادت گاہوں کو (باستثنا بابری مسجد) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی حالت پر باقی رکھا جائے گا۔ یہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اب حکومت اتنا اور کرے کہ وہ عبادت گاہوں کے تحفظ کے اس ایکٹ کو دستور ہند کا جز بنا دے۔ دستور کا حصہ بننے کے بعد بقیہ عبادت گاہوں کے تحفظ کی زیادہ پائدار ضمانت حاصل ہو جائے گی۔

آخری بات

مذکورہ تین نکاتی فارمولے میں ہر فریق کی رعایت ہے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ ہر ایک کے لیے قابل قبول حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو مان لینے کے بعد ایک طرف موجودہ حالات میں اعتدال آئے گا۔ اور دوسری طرف اس سے جو پُر امن فضا پیدا ہوگی وہ بے روک ٹوک ملک کی ترقی کی ضمانت بن جائے گی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اور اس کے بعد ملکی اور بین اقوامی سطح پر جو حالات پیش آئے ہیں وہ بیحد قابل غور ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ اب یہ حتمی فیصلہ کر لیا جائے کہ اجودھیا کے تجربہ کو اب کہیں اور نہیں دہرانا ہے۔ موجودہ حالات میں کسی مسجد کو توڑ کر وہاں مندر تعمیر کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ ۶ دسمبر نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ دستور، قانون، اخلاقی روایات، سب کو بیک وقت ڈھا دیا جائے۔ ایک عمارتی ڈھانچہ کی خاطر پورے ملک کے

ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ ڈالا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد۔مندر تحریک کے انتہا پسند لیڈروں کے لیے جو انتخاب (Choice) ہے وہ مسجد اور مندر کے درمیان نہیں ہے، بلکہ مسجد اور بربادی کے درمیان ہے۔ انڈیا میں سابق امریکی سفیر جے کے گال بریتھ نے انڈیا کو ایک فنکشننگ انارکی بتایا تھا۔ اگر موجودہ قسم کی مندر۔مسجد تحریک جاری رہی تو یقینی طور پر آئندہ آنے والا مبصر اس ملک کو ننگی انارکی (naked anarchy) کہنے پر مجبور ہوگا۔

بھارت کی آج کی نسل کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنی اگلی نسل کو کون سا بھارت دینے جا رہی ہے۔ ایک ترقی یافتہ بھارت یا ایک ایسا تباہ شدہ بھارت جو کسی کے لیے سرے سے رہنے کے قابل ہی نہ ہو، نہ ہندو کے لیے اور نہ مسلمان کے لیے اور نہ کسی اور کے لیے۔

یہ دنیا تبدیلی اور انقلاب کی دنیا ہے
اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینا پڑتا ہے
نئے حالات میں جو لوگ نیا فیصلہ نہ لے سکیں
وہ کامیابی کے ساتھ زندگی کا سفر طے نہیں کر سکتے

اجودھیا کا سبق

اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ پیش آیا، اس کا سامنا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو ٹریجڈی کے طور پر نہ لیا جائے بلکہ سبق کے طور پر لیا جائے۔ اگر ہم اجودھیا کو اس ذہن کے تحت لیں تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم دوبارہ اجودھیا کو کسی نئی ٹریجڈی میں تبدیل ہونے سے بچا سکیں۔

۱۔ بابری مسجد کا مسئلہ اتنا گمبھیر کیوں بنا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا نام بابری مسجد تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابر کے نام کے ساتھ اس ملک کی ایک خاص تاریخ وابستہ ہے۔ چنانچہ اجودھیا کے اسٹرکچر کو جب بابری مسجد کے نام سے پکارا گیا تو ہندو اور مسلمان دونوں کو وہ ایک مخصوص تاریخ یاد دلانے کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ مسلمان نے بابری مسجد کو اپنی فتح کی علامت کے طور پر دیکھا۔ اور ہندو نے بابری مسجد کو دیکھا تو وہ اس کو اپنی ہار کی علامت کے روپ میں نظر آئی۔

اس طرح دونوں دو الگ الگ نفسیات کے تحت بابری مسجد کے اوپر جم گئے۔ ہندو کو نظر آیا کہ نئے انڈیا میں اگر اپنی سیاسی شکست کی علامت کو مٹانا ہے تو بابری مسجد کو ڈھا دینا پڑے گا۔ اس کے برعکس مسلمان نے محسوس کیا کہ اسے ہر حال میں بابری مسجد کو بچانا ہے تاکہ اس کے فاتحانہ ماضی کا نشان بدستور باقی رہے۔ اسی دو طرفہ ٹکراؤ کا وہ آخری نتیجہ تھا جو ۶ دسمبر کو پیش آیا۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی عبادت گاہ کو سادہ طور پر صرف عبادت گاہ یا مسجد کہنا چاہیے۔ اس کو "بابری مسجد" جیسا نام دینے سے مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔

۲۔ بابری مسجد ۱۵۲۸ء میں تعمیر ہوئی۔ مگر وہ باقاعدہ مسئلہ ۱۹۸۶ میں بنی جب کہ انتظامیہ نے اس کے بند تالے کو کھول دیا۔ یہ تالا اتفاقاً نہیں کھلا۔ اس کا براہ راست سبب وہ ایجی ٹیشنل تحریک تھی جو عام طور پر شاہ بانو تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے پُرشور مطالبہ کے نتیجہ میں جب حکومت نے یہ طے کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا کے متعلق ایک نیا ایکٹ بنائے۔ اسی وقت اس نے ہندو لیڈروں کے مطالبہ کی بنا پر، یہ بھی طے کیا کہ بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ مسلم اور ہندو دونوں کو مطمئن کیا جا سکے۔

اس میں یہ سبق ہے کہ کسی پلورل سوسائٹی میں اس کا ایک گروپ اگر اپنے لیے ایک امتیازی

حق کی مانگ کرتا ہے تو اس کو جاننا چاہیے کہ دوسرا گروپ بھی اسی کے مساوی کوئی چیز اپنے لیے لینا چاہے گا۔ اس طرح عملاً یہ ہوگا کہ اس کے لیے ایک نئی محرومی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا جو اس کی یافت کی مکمل نفی کر دے گا۔

۳۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابری مسجد کا تالا کھلنے کے بعد بھی ابتداءً یہ مسئلہ تمام تر صرف ایک مقامی مسئلہ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ٹاؤن کا مسئلہ تھا۔ مگر اس کے نام پر جب دونوں طرف سے پورے ملک میں ایجی ٹیشن چلایا گیا تو وہ مقامی حد سے نکل کر ایک آل انڈیا مسئلہ بن گیا۔ حتی کہ وہ یہاں تک بڑھا کہ وہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں فرقوں کے لیے وقار کے مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح غیر متناسب طور پر بڑھانے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ موجودہ المناک وسعت تک پہنچ گیا۔ ورنہ مسئلہ بننے کے بعد بھی وہ ایک گم نام مسئلہ رہتا جیسا کہ اس سے پہلے کئی سو سال تک وہ گم نام مسئلہ بنا ہوا تھا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ سماجی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو حل کرنے کی کوشش ہمیشہ اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ابتدائی دائرہ میں محدود رہے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

۴۔ آخری بات یہ کہ اس معاملہ میں اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں میں کہوں گا کہ جو لوگ یہ مانگ کر رہے ہیں کہ بابری مسجد دوبارہ وہیں بناؤ وہ ایک ختم شدہ معاملہ کو دوبارہ نئی شدت کے ساتھ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا ہے۔ اور تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔

اسی نزاکت کے پیش نظر میں نے اس معاملہ میں اپنا سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) مسلمان اب بابری مسجد کے لیے اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں (۲) ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو ہمیشہ کے لیے اجودھیا میں اسٹاپ کر دیں، اس کے بعد وہ کسی بھی دوسری مسجد کا باب ہرگز نہ کھولیں (۳) حکومت یہ کرے کہ عبادت گاہوں کا تحفظ کے قانون ۱۹۹۱ کو دستور میں شامل کر کے اس کو بنیادی حقوق کا جزء بنا دے۔

یہ فارمولا دونوں فرقوں کے لیے باعزت سمجھوتہ کی ایک بنیاد ہے۔

زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ناخوش گوار حقیقت کو ماننا پڑتا ہے۔ کیوں کہ علمی اعتبار سے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔ فارمولے کا پہلا نکتہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ بابری مسجد کے معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو چوائس ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ اسی جگہ پر بنائیں۔ حقیقی چوائس یہ ہے کہ بابری مسجد کو اسی جگہ بنانے کی کوشش میں ہزاروں نیا مسئلہ اپنے لیے کھڑا کرلیں۔

فارمولے کا دوسرا نکتہ اس مقصد کے لیے ہے کہ اس قسم کی بھیانک غلطی کو اب کسی اور مسجد کے معاملہ میں نہ دہرایا جائے۔ یہ نکتہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد ہر پیش آنے والے واقعات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہندو صاحبان کے لیے جو چیز ممکن ہے وہ مسجد کی جگہ مندر بنانا نہیں ہے۔ بلکہ مسجد کی جگہ مندر بنانے کے جوش میں پورے ملک کو تباہ و برباد کر دینا ہے۔

تیسرا نکتہ قانونی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے مسجد اور عبادت گاہ کے معاملہ کو اس طرح مستحکم کر دیا جائے کہ اب کوئی فریق دوبارہ اس قسم کی غلطی نہ کر سکے۔ اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس بات کی مستحکم قانونی ضمانت فراہم کر دی جائے کہ ۱۹۴۷ میں جو مسجد یا عبادت گاہ جس حال میں تھی، اسی حال میں اس کو برقرار رکھا جائے گا۔

چونکہ اس معاملہ میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندو سائڈ کی طرف سے ایک جارحانہ اقدام کیا گیا ہے اور بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو کسی جواز کے بغیر توڑ دیا گیا ہے، اس لیے اب سب سے پہلے ہندو سائڈ کو یہ کرنا ہے کہ ان کی طرف سے ایک تحریری ڈیکلریشن جاری ہو۔ اس میں فارمولے کے تینوں اجزا کو صدق دل سے تسلیم کرنے کا متفقہ اعلان کیا گیا ہو۔

اس ڈیکلریشن پر چاروں شنکراچاریہ دستخط کریں۔ تمام ان سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار اس پر دستخط کریں جو اجودھیا کے اشو میں شامل رہی ہیں۔ ملک کے مشہور اور معتمد افراد کا تصدیقی دستخط بھی اس میں شامل ہو۔ اسی کے ساتھ حکومت کی طرف سے اس کا ذمہ دار اس پر اپنا دستخط ثبت کرے۔ اس قسم کا ایک ڈیکلریشن جاری ہونے کے بعد وہ بحران ختم ہو جائے گا جس سے ۶ دسمبر کے بعد پوری قوم دوچار ہو گئی ہے۔

آگے کی طرف

آگے کو یاد رکھنا اور پیچھے کو بھلا دینا ——— یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں ہر فرد اور ہر گروپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ حادثات اکثر حالات میں قابل واپسی نہیں ہوتے۔ جو لوگ ان حادثات کو یاد رکھیں وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ان حادثات کو بھلا کر از سر نو زندگی شروع کرنے کی تدبیر کریں وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بھلانے کا یہ اصول ایک یونی ورسل اصول ہے۔ اس میں کسی بھی فرد یا کسی بھی گروپ کا کوئی استثناء نہیں۔

انڈیا کے ہندو اور مسلمان دونوں آج اسی امتحان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ پیچھے کی بات کو بھلا دیں اور آگے کی بات کو لے کر اپنی عملی جد و جہد شروع کر دیں۔ دونوں کے لیے ترقی اور کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا ممکن راستہ ان کے لیے نہیں۔

مختصر طور پر یہ کہ انڈیا کے ہندوؤں کو بٹوارہ کو بھلا دینا ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں کو بابری مسجد کو بھلا دینا ہے۔ دونوں ہی ماضی کی یادوں کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے ہیں ہندو کے لیے ان یادوں کا علامتی عنوان "بٹوارہ" ہے۔ اور مسلمان کے لیے ان یادوں کا علامتی عنوان "بابری مسجد"۔ اگر دونوں یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک ترقی یافتہ مستقبل کی تعمیر کریں تو دونوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اپنے ذہن کو ماضی کی یادوں سے نکالیں اور مستقبل کی روشنی میں سوچنا شروع کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو نہ صرف یہ کہ دونوں فرقے کی ترقی رکی رہے گی۔ بلکہ وسیع تر اعتبار سے خود ملک کا مستقبل بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں غیر ملکی لوگوں کا "ظلم" تو ملک کو تباہ نہ کر سکا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد ملکی لوگوں کی نادانی ضرور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔

برادران وطن کے ایک طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کو مسلسل طور پر اپنا رقیب اور حریف بنائے ہوئے ہیں۔ جس

کا اظہار مختلف ناخوشگواریوں کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ بٹوارہ کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اب برادرانِ وطن کے لیے اس کے سوا کوئی متبادل صورت نہیں کہ وہ بٹوارہ کو گزری ہوئی تاریخ کے خانے میں ڈال دیں اور یہ بھول جائیں کہ کس نے بٹوارہ کرایا اور کس نے اس کی مانگ کی۔ اب مسئلہ بٹوارہ کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بٹوارہ کا حساب چکانے میں خود ملک تباہ ہوا جارہا ہے۔

۱۹۴۷ تک بٹوارہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ مگر اب یہ خود ہندوؤں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ کیوں کہ بٹوارہ کی یاد ان کے اندر معتدل نفسیات پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اور جب تک معتدل نفسیات نہ آئے وہ ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔

بٹوارہ بذاتِ خود کوئی ایسا حادثہ نہیں جو باہمی ترقی کی راہ میں ناقابلِ عبور رکاوٹ بن جائے۔ تاریخ کی متعدد مثالیں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ ایک تازہ مثال جرمنی کی ہے۔ ۱۹۴۸ میں جرمنی کی تقسیم ہوئی۔ مگر یہ تقسیم مغربی جرمنی کو ترقی کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکی۔

دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں جرمنی کی اقتصادیات بالکل تباہ ہوگئی۔ اس کو مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی میں بانٹ کر اسے کمزور کر دیا گیا تھا۔ الائیڈ ہائی کمیشن (Allied High Commission) کی کونسل نے ۱۹۴۹ میں مغربی جرمنی کے لیے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ اس کے یہاں کوئی نیشنل پولیس نہ ہوگی، وہ صرف میونسپلٹی کی سطح کی پولیس رکھ سکے گا۔ وغیرہ۔

مگر تقسیم اور کمزوری جرمنی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ وہ اپنی جدوجہد سے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ یورپ کا نمبر ایک ملک بن گیا، جرمنی اس شاندار انجام تک کیسے پہنچا، کچھ لوگ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس نے دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلے میں دیر سے اپنا ترقی کا سفر شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو سفر شروع کرنے والے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پہلے شروع کرنے والوں سے اعلیٰ ٹکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں:

Late starters can grow faster because they can borrow advanced technology from the early starters. (6/214)

یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ بعد کو شروع کرنے والوں میں تو انڈیا بھی ہے مگر وہ اب

تک کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکا۔ اصل یہ ہے کہ مغربی جرمنی کی تیز رفتار ترقی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے دوسری عالمی جنگ کے نقصان اور اس کے بعد ہونے والی ملکی تقسیم کو بھلایا۔ گزرے ہوئے ماضی کو بھلا کر اس نے اپنی تمام طاقت آنے والے مستقبل کی تعمیر میں لگا دی۔

بدقسمتی سے ہندوؤں کی ایک تعداد، خاص طور پر شمالی ہند کے ہندوؤں کی اکثریت ۱۹۴۷ میں ہونے والے بٹوارہ کو بھلا نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کا علاقہ، جو ملک کا قائدانہ علاقہ ہے، وہ زیادہ تر منفی سرگرمیوں میں پڑا رہا۔ وہ یکسوئی کے ساتھ مستقبل کی تعمیر میں اپنے آپ کو وقف نہ کر سکا۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ برادرانِ وطن اس کوتاہی کو محسوس کریں۔ وہ بٹوارہ کی نفسیات سے اپنے آپ کو خالی کر کے نئے انڈیا کی مثبت تعمیر میں لگ جائیں۔ اس کے بعد وہ دن دور نہیں جب کہ ملک تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر شروع کر دے اور عالمی نقشہ میں اپنے لیے وہ باعزت جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

اب انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کو لیجئے۔ ملک کے مختلف فرقوں میں وہ پہلے ہی ترقی کے اعتبار سے پیچھے تھے، اب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد وہ مزید مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے لیے اس ملک میں ترقی کے مواقع موجود نہیں۔

یہ سوچ سراسر غلط ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی بھی خارجی حادثہ کسی قوم کے عروج و زوال کا فیصلہ نہیں کرتا۔ کسی قوم کے عروج و زوال میں جو چیز فیصلہ کن بنتی ہے وہ اس قوم کی داخلی طاقت ہے، نہ کہ خارجی واقعات۔ قومیں ہمیشہ اپنے داخلی عزم سے آگے بڑھتی ہیں۔ اگر عزم و ہمت موجود ہو تو کوئی بھی خارجی حادثہ قوم کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

جہاں تک مسجد کا تعلق ہے، تو مسجدوں کے ساتھ اس طرح کے حادثات بار بار پیش آئے ہیں۔ ۶۹۲ء میں حجاج بن یوسف کی فوجوں نے کعبہ کے اوپر منجنیق کے ذریعہ گولہ باری کی۔ حتی کہ تاریخ میں اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گئے کہ مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حرم پر گولہ باری کی گئی۔ اور کعبہ میں آگ لگا دی گئی۔ مقدس حجر اسود تین جگہ سے ٹوٹ گیا:

Mecca was besieged, the haram bombarded with missiles, and the Kaba set on fire, the sacred Black Stone was split in three pieces. (1/1047)

اس کے باوجود اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ اور کعبہ کی مقدس مسجد پر گولہ باری کرنے والوں ہی نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی۔ ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے مسلم دنیا پر حملہ کیا اور سمرقند سے حلب تک سیکڑوں مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر اس حادثہ کے بعد بھی اسلام کی تاریخ نہیں رکی اور دوبارہ انھیں تاتاریوں نے ان تمام مسجدوں کو پھر سے تعمیر کرایا۔ خود انڈیا میں ۱۹۴۷ میں ہریانہ اور پنجاب اور راجستھان کے علاقہ میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مگر اس کے باوجود یہاں اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ پھر اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے کیوں ایسا ہوگا کہ اسلام کی تاریخ آگے بڑھنے سے رک جائے گی۔

اس وقت مسلمانوں کے لیے اہم بات یہ نہیں ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھا دی گئی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب بھی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں انڈیا میں موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں ان کے چھوٹے اور بڑے مدرسے سارے ملک میں قائم ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے اسلامی ادارے اور اسلامی جماعتیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ۶ دسمبر کا حادثہ پیش آنے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ترقی کے تمام مواقع بدستور یہاں موجود ہیں۔

ایسی حالت میں ان کے لیے مایوسی یا دل شکستگی کا کوئی سوال نہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ نئے عزائم کے ساتھ اپنی تعمیر کا عمل شروع کر دیں، اور پھر بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ۶ دسمبر کو انھوں نے جتنا کھویا تھا اس سے بہت زیادہ انھوں نے ۶ دسمبر کے بعد یہاں اپنے لیے پالیا ہے۔ یہی ماضی کا پیغام ہے اور یہی مستقبل کی پکار بھی۔

ہمت کا امتحان

انڈیا میں مسجد۔ مندر کا جھگڑا پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں فرقوں کے درمیان موجودہ قسم کی سرگرمیاں اس جھگڑے کو صرف بڑھاتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد اب یہ قضیہ اس مرحلہ میں پہنچ گیا ہے کہ بی جے پی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے اس کو قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔ مسٹر جے ایس یادو (J.S. Yadava) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (۲ جنوری ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Turning adversity into an opportunity.

اس میں انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اب ہمارے سماج کے لیے سرطان بن گیا ہے۔ اور ۶ دسمبر کو بابری مسجد کا ڈھایا جانا اس عداوتی سرطان کا پہلا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود قوم کا بقا اس وقت داؤ پر لگا ہوا ہے:

It has become cancerous and the demolition of the Babari Masjid is the first major eruption of the malignant tumor of Indian polity. The very survival of our nation is at stake. (p. 11)

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس مسئلہ کو لامتناہی طور پر جاری رکھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اس آخری حد پر پہنچ جائے کہ ہر طرف انارکی پھیل جائے۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں دو برباد فرقے بن کر رہ جائیں جس طرح لبنان اور یوگوسلاویہ میں اسی طرح کے جھگڑوں کے نتیجہ میں پیش آچکا ہے۔

یا ہم ایسا کریں گے کہ مسجد اور مندر کے جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے تاکہ ملک ترقی کے راستہ پر بے روک ٹوک اپنا سفر شروع کر سکے اور بالآخر ایک طاقت ور قوم کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر نمایاں ہو۔ ہر محب وطن یقیناً یہ کہے گا کہ ہمیں اسی دوسری بات کا فیصلہ کرنا چاہیے اور جرأت مندانہ طور پر ایک ایسے حل پر راضی ہو جانا چاہیے جس میں یکساں طور پر دونوں فرقوں کا بھلا ہو۔

زندگی مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو نادان آدمی اپنی نادانی سے اس کو بگاڑ لیتا ہے، اور دانش مند آدمی مسئلہ کو عبور کرکے دوبارہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ یہاں بار بار اونچ نیچ کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں ہمیشہ احوال وظروف بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو لوگ بدلے ہوئے حالات میں نیا فیصلہ لے سکیں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو لوگ نیا فیصلہ لینے کی دانش مندی نہ دکھا سکیں وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دور اول میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وطن چھوڑ کر مکہ سے مدینہ جانے کا ارادہ کیا تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کے لیے آگے بڑھنے کے بجائے آپ نے یہ طے کیا کہ جہاں سے آئے تھے وہیں دوبارہ واپس چلے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب خالد بن الولیدؓ نے یہ منصوبہ بنایا کہ رومیوں سے لڑائی جاری رکھنے کے بجائے اپنی فوجوں کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں بار بار اس طرح کے نئے فیصلے لیے گئے ہیں۔ یہی نئے فیصلے تھے جن کی وجہ سے اسلام کی تاریخ مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ اگر اہل اسلام میں نیا فیصلہ لینے کی طاقت نہ ہوتی تو اسلام کی تاریخ بند گلی میں پھنس کر رہ جاتی، وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی۔

آج عالمی سطح پر مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نیا فیصلہ لینے کی صلاحیت کھو دی ہے۔ ان کے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف راستہ کی رکاوٹوں سے ٹکرانا جانتے ہیں، وہ رکاوٹوں سے ہٹ کر اپنے لیے نیا راستہ بنانا نہیں جانتے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہ صورت پیش آئی کہ مسلم رہنماؤں کو کوئی نیا فیصلہ لینا تھا۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ ایک بار جس راستہ پر چل پڑے، بس آنکھ بند کرکے اس پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ خود بھی خندق میں گرے اور قوم کو بھی خندق میں گرا دیا۔

یہ دنیا ایک تغیر پذیر دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کے لیے تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں ترقی اور کامیابی ممکن نہیں۔

یہ دنیا ایک بدلتی ہوئی دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کو بار بار تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ تخلیقی صلاحیت ہی اس تغیر پذیر دنیا میں ترقی کا واحد راز ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں کسی کے لیے بھی ترقی اور کامیابی کو پانا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بولنا شروع کرتا ہے۔ پھر حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ آدمی آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر حالات کہتے ہیں کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ۔ آدمی ایک مانگ لے کر اٹھتا ہے۔ پھر حالات پکارتے ہیں کہ اپنی زبان بند کر لو۔ آدمی حالات کا ایک اندازہ کر کے اپنا منصوبہ بناتا ہے۔ پھر حالات کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اور ضرورت ہوتی ہے کہ نیا نقشہ اور نیا منصوبہ بنایا جائے۔

اس دنیا کا یہ قانون افراد کے لیے بھی ہے اور قوموں کے لیے بھی۔ یہاں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو پیش آمدہ مواقع پر نیا فیصلہ لے سکیں۔ جو لوگ حالات کے مطابق نیا فیصلہ لینے سے محروم رہیں وہ یقیناً کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے بھی محروم رہیں گے۔

جب بھی کوئی نیا فیصلہ لیا جاتا ہے تو اس میں رسک بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ رسک زندگی کا ایک ناگزیر عنصر ہے۔ رسک لیے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی عمل نہیں کیا جا سکتا، نہ شخصی سطح پر اور نہ قومی سطح پر۔ رسک سے خالی دنیا صرف قبرستان میں مل سکتی ہے۔ جہاں تک زندگی کے میدانوں کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ رسک سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

زندگی میں جب بھی کوئی نیا موڑ آتا ہے تو وہ افراد اور قوموں کے لیے امتحان ہوتا ہے۔ یہ موڑ ہر ایک کے لیے آتا ہے، موڑ آنے پر جو لوگ وہاں مڑنے سے ہچکچائیں وہ ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ اور جو لوگ موڑ آنے کے بعد حوصلہ کیساتھ آگے بڑھ جائیں، وہی انقلابات کی اس دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

اجودھیا کا مسئلہ جو اس وقت ملک کے اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان نزاع کا سبب بنا ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کا ایک موڑ ہے۔ ضرورت ہے کہ دونوں فرقے اس نازک تاریخی موقع پر نیا فیصلہ لینے کی ہمت کریں۔ کسی انقلابی فیصلہ تک پہنچنا صرف اس وقت ممکن ہوگا جبکہ دونوں حوصلہ مندی کا ثبوت دیں، دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ حتیٰ کہ خطرہ مول لے کر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ زندگی ہمت کا امتحان ہے، اور اجودھیا آج دونوں فرقوں کے لیے اسی ہمت کا امتحان بن گیا ہے۔

سب سے بڑا خطرہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد پوری قوم میں نہایت شدت کے ساتھ خود احتسابی کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ عام طور پر یہ سوچا جا رہا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آزادی کے تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارا ملک ترقی کی طرف اپنا سفر شروع نہ کر سکا۔ ہمارے عوام و خواص آج بھی اشوز اور نان اشوز کا فرق نہیں سمجھتے۔ وہ ایک نظر انداز کرنے والے معاملہ پر بھی اسی جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح ایک ایسے معاملہ پر کھڑا ہونا چاہیے جو نظر انداز کرنے کے قابل نہ ہو۔

اس نیشنل ڈیبیٹ میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں ان میں بظاہر دو گروپ ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ جس کا کہنا ہے کہ ساری قومی مصیبتوں کی جڑ بناوٹی سیکولرزم (Pseudo secularism) ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ تمام مصیبتیں بناوٹی ہندوازم (Pseudo Hinduism) کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ہی سطحی توجیہیں ہیں۔ ہماری موجودہ مصیبتوں کی اصل جڑ وہ چیز ہے جس کو میں بناوٹی انٹلکچولزم (Pseudo intellectualism) کا نام دینا پسند کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر سماج میں ہمیشہ خواص کا ایک طبقہ ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کو آپ رائے بنانے والے (opinion makers) کہہ سکتے ہیں۔ یہ طبقہ پچھلے سماجوں میں بھی موجود رہتا تھا۔ مگر اب پریس اور میڈیا کے ذرائع وجود میں آنے کے بعد اس طبقہ کا رول بہت بڑھ گیا ہے۔ پچھلے سماج میں کوئی رائے بنانے والا اپنی باتوں سے جتنے لوگوں کو متاثر کر سکتا تھا، آج اس سے ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر متاثر کرنا ایک شخص کے لیے ممکن ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں، مختلف اسباب سے، ہمارے انٹلکچول کلاس نے بہت غلط کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے پوری قوم، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوچ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو آدمی کے اندر صحیح ذہن بنے گا۔ اور اگر ان کو غلط رخ سے دیکھا جائے تو غلط

ذہن بننے لگے گا۔ انٹلکچول کلاس کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی فکری تربیت اس طرح کرے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کو صحیح رخ سے دیکھ سکیں۔ مگر ہمارے ملک کا انٹلکچول کلاس اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو درست طور پر نبھانے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔

اپنے ناقص علم کی بنا پر یا اپنے حقیر مفادات کی بنا پر، اس نے یہ کیا کہ نان اشو کو اشو بنایا۔ ایک واقعہ جس کا تعلق کسی اور پہلو سے تھا اس کو کسی اور پہلو سے جوڑ دیا۔ ایک معاملہ جو نظر انداز کرنے کے قابل تھا اس کو بڑھا چڑھا کے پیش کر کے اس پر لوگوں کو بھڑکا دیا۔ دس باتوں میں نو باتیں اگر اچھی تھیں تو ان نو باتوں کو بیان نہیں کیا اور ایک بری بات کا چرچا زور شور کے ساتھ ہر طرف پھیلا دیا۔ ایک چیز جو افواہ کے نوعیت کی تھی، اور ضرورت تھی کہ اس کی تحقیق کی جائے، مگر بلا تحقیق اس کو شہرت دینا شروع کر دیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی سوچ بگڑ گئی۔ اب عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نہ مسائل کا صحیح تعین کر پاتے اور نہ یہ سمجھ پاتے کہ ان مسائل کے حل کے لیے انھیں کیا کرنا چاہیے۔ پہلے وہ زیادہ تر اپنی فطرت اور کامن سنس کی رہ نمائی میں ایک قریبی فیصلہ کر لیتے تھے، مگر اب میڈیا کے دور میں وہ انٹلکچول کلاس کی باتوں کو سن کر یا پڑھ کر رائے بناتے ہیں، اس بنا پر سارا معاملہ غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہاں میں کچھ مثالیں دوں گا :

۱۔ ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے پچھلے کچھ برسوں سے ہندوؤں میں نہایت شدت کے ساتھ یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ کانگریس پارٹی اپنے طویل دور حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ خوش کرنے (Appeasement) کی پالیسی چلاتی رہی ہے۔ اس پالیسی کی ایک روشن مثال (glaring example) ان کے نزدیک، شاہ بانو تحریک کے بعد بننے والے اس ایکٹ کی ہے جس کا پورا نام اس طرح ہے :

Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Act 1986

اس ایکٹ کو راجیو گاندھی کی حکومت نے منظور کیا تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی سے جوڑنا سراسر بے اصل ہے، کیونکہ خوش کرنا ایک ایسا کام ہے جو یک طرفہ طور پر کیا جاتا ہے۔ جب کہ یہاں واضح طور پر دو طرفہ معاملہ کیا گیا۔ راجیو گاندھی کی حکومت نے ۶ مئی ۱۹۸۶

کو یہ ایکٹ لوک سبھا میں منظور کرایا تھا، مگر جب کانگریسی حکومت نے اس "مسلم نوازی" کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ اس نے زیادہ بڑے پیمانہ پر "ہندو نوازی" کا عمل کیا۔ چنانچہ اس نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کے دروازے پر عدالتی فیصلہ کے تحت لگے ہوئے تالے کو کھلوا دیا۔ دونوں کا تقابل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ اگر اپیزمنٹ ہوا تو ہندوؤں کے ساتھ سپر اپیزمنٹ کا معاملہ کیا گیا۔

ہندو دانشوروں نے تالا کھولنے کے معاملہ کو حذف کر کے ایکٹ بنانے کے معاملہ کو خوب بڑھا چڑھا کر پھیلایا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو انھوں نے مسموم کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں اور اس طرح کی دوسری باتوں کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ ہندو لوگ دیش کی مثبت تعمیر کے بجائے مسلمانوں کے خلاف منفی سرگرمیوں میں اپنی طاقت صرف کرنے لگے۔

اب اسی نوعیت کی برعکس مثال لیجئے جب کہ انٹلکچول کلاس نے اپنا صحیح رول ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں قوم کو زبردست ترقی کا تحفہ ملا۔ یہ دوسری مثال جاپان کی جدید تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔

ہیروشیما کو جاپان کے ایک بڑے شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ ہیروشیما میں جنگی اہمیت کی صنعتیں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۸ کے بعد تقریباً ۷۵ سال تک اس کو جاپان میں سب سے بڑے ملٹری سنٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکہ نے ہیروشیما کے اوپر ایٹم بم گرایا اور اس کو پوری طرح تباہ کر دیا۔

اس کے بعد جاپان میں امریکہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔ خاص طور پر فوج کے لوگ امریکہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت جاپانیوں میں سے کچھ سچے قسم کے انٹلکچول اٹھے۔ انھوں نے پوری جاپانی قوم کی سوچ کو بدل دیا۔

انھوں نے جاپانیوں کو بتایا کہ اگست ۱۹۴۵ میں امریکہ نے اگر ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا تو اس سے پہلے دسمبر ۱۹۴۱ میں ہم امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے، اس طرح معاملہ برابر ہو گیا۔ اس بات نے جاپانیوں کے ذہن کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ منفی رخ پر دوڑنے کے بجائے

ثبت رخ پر چل پڑے۔ وہ امریکہ کی تخریب کے بے فائدہ عمل میں لگنے کے بجائے خود اپنی تعمیر کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ایک عظیم ترقی کی صورت میں آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔

ہندو دانشور اگر سچی دانشوری کرتے تو وہ ہندوؤں سے کہتے کہ حکومت نے اگر مسلمانوں کو پرسنل لا ایکٹ دیا ہے تو تم کو بھی اس نے ایک بہت بڑی چیز دی ہے۔ وہ یہ کہ بابری مسجد کا بند تالا کھول کر اس کے اندر تم کو درشن اور پوجا کی اجازت دے دی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انڈیا میں بھی وہی واقعہ ہوتا جو جاپان میں پیش آیا۔ مگر ہندو دانشور جاپانی دانشوروں جیسی رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ اس کا نتیجہ عظیم تباہی کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کی ایک اصل توجیہہ ہوتی ہے، اور ایک اصل حقیقت سے ہٹی ہوئی توجیہہ۔ عام آدمی اس فرق کو سمجھ نہیں پاتا۔ یہ خواص (انٹلکچول کلاس) کا کام ہے کہ وہ واقعہ کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کی صحیح توجیہہ لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے (النساء ۸۳)

بدقسمتی سے انڈیا میں دونوں فرقوں کے انٹلکچول کلاس نے اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا۔ دونوں ہی نے ذہن کو بگاڑنے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ ایک طرف ہندوؤں کے انٹلکچول کلاس کے لوگوں نے واقعات کو غلط انداز میں پیش کر کے ہندوؤں کی سوچ کو زہر آلود کر دیا۔ دوسری طرف مسلم انٹلکچول کلاس نے مسلمانوں کی سوچ کو الٹے رخ پر موڑ دیا۔ یہاں تک کہ دو پڑوسی فرقے جو سیکڑوں سال سے ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن کر کھڑے ہو گئے۔

قرآن میں ایک مرد کو چار عورتوں تک سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ قطعی طور پر ایک ایمرجنسی کا قانون ہے۔ مگر ہندو دانشوروں نے اس کو انتہائی خلاف واقعہ طور پر عام حکم

کی حیثیت دے دی۔ انھوں نے ہندو کو بتایا کہ دیکھو، پاکستان بنوا لینے کے بعد بھی مسلمان تمہارے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ ہر مسلمان اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق، چار شادی کرتا ہے اور بے تحاشا بچے پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو جائے۔ اور وہ یہاں تمہارے اوپر حکومت کرنے لگیں۔

یہی خطرہ کی نفسیات مسلم دانشوروں نے بھی مسلمانوں کے اندر بڑے پیمانہ پر پیدا کی۔ ملک کا بٹوارہ ہندو۔ مسلم منافرت کی بنا پر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد لوگ معمولی معمولی باتوں پر بھڑکنے لگے اور فساد کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان فرقہ وارانہ فسادات کا اصل سبب صبر و اعراض نہ کرنا تھا۔ مگر مسلم دانشوروں نے اس کو غلط طور پر اس مفروضہ سے جوڑ دیا کہ ہندو انڈیا کو مسلمانوں کے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں اور ہندو لیڈر بار بار اسپین کا سفر کر رہے ہیں تاکہ وہاں سے وہ تکنیک سیکھ کر آئیں جس کو یہاں دہرا سکیں۔

یہ دونوں ہی باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی کوئی اصل نہ تھی مسلمانوں میں چار شادی یا اضافہ آبادی کی بات سراسر افسانہ تھی۔ اسی طرح ہندوؤں کے بارہ میں یہ بات قطعی طور پر ایک افواہ تھی کہ وہ انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر دونوں طرف کے دانشوروں نے ان کو عوام میں اس طرح پھیلایا کہ یہ خیالات دونوں فرقوں کے اوپر کابوس بن کر چھا گئے۔

یہی بابری مسجد کے سلسلہ میں پیش آیا۔ ایک طرف ہندو دانش وروں نے دوسری ہار (second defeat) کا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کا بٹوارہ تمہارے لیے پہلی ہار تھی۔ اب بابری مسجد کی جگہ رام مندر کا نہ بننا تمہارے لیے دوسری ہار ہوگی۔ چنانچہ ہندو بھڑک اٹھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی ہار ہم نے انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے برداشت کر لی۔ اب ہم آزاد ہیں، اب ہم کسی قیمت پر دوسری ہار کو قبول نہیں کریں گے۔

دوسری طرف مسلم دانشوروں نے "علامت" کا جھوٹا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کا معاملہ صرف ایک مسجد کا معاملہ نہیں ہے، وہ پوری ملت کے وجود و بقا کی علامت ہے۔ اگر یہاں ہم پیچھے ہٹے تو اس کے بعد اس ملک سے ہمارا سارا خیمہ اکھڑ جائے گا۔ مگر یہ ایک لغو بات تھی۔ چنانچہ بابری مسجد کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا اور ملت کا وجود بدستور پوری طرح باقی ہے۔

ناامیدی میں امید

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی۔ اس کے بعد ۶ جنوری ۱۹۹۳ کو دہلی کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کا خاتمہ کرنے میں ہمارے دشمن کامیاب ہو گئے۔ اب آپ کی رائے کیا ہے۔ کیوں کہ اب تو اس معاملہ میں ہمارے لیے امید کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔

میں نے کہا کہ اس دنیا میں امید کی مقدار، ناامیدی کی مقدار سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں یقینی طور پر مجھے اب بھی امید کا پہلو دکھائی دے رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کا ایک ایک پتھر وہاں سے ہٹا دیا اور جہاں پہلے بابری مسجد تھی وہاں اپنا ایک عارضی مندر بنا کر کھڑا کر دیا۔ اب کس پارٹی میں یا کس حکومت میں یہ طاقت ہے کہ وہ رام مندر کو وہاں سے ہٹائے اور دوبارہ وہاں بابری مسجد کی تعمیر کرے۔ جب صورت حال یہ ہے تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے اب بھی امید کا پہلو موجود ہے۔

مذکورہ گفتگو کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ اکثر لوگوں کے لیے مایوسی کا سبب کیا ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ ناامیدی کے مواقع پر امید کا پہلو دیکھ نہیں پاتے۔ وہ دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا سبب سوچ کی کمزوری ہے۔ وہ عین اسی مقام پر امید کا پہلو دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ان کے ساتھ ناامیدی کا واقعہ پیش آیا ہے۔ اور چونکہ اکثر حالات میں امید کا مقام ناامیدی کے مقام سے الگ ہوتا ہے، اس لیے لوگ یہ سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امید کا پہلو یہاں موجود ہی نہیں۔

مذکورہ مسلمان سے جب میں نے کہا کہ اجودھیا کے واقعہ میں ہمارے لیے امید کا پہلو موجود ہے تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ امید کا یہ پہلو خود اجودھیا ہی میں موجود ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اجودھیا کی سطح پر اگرچہ بظاہر امید کا پہلو ختم ہو گیا ہے۔ مگر ملت کی سطح پر امید کا پہلو اب بھی پوری طرح پایا جا رہا ہے۔

میرا مطلب یہ تھا کہ یہ حادثہ انشاء اللہ مسلمانوں کے لیے زحمت میں رحمت، (beginning of the end) ثابت ہوگا۔ یہ واقعہ ان کے ذہن کو جھنجوڑ دے گا۔ وہ ان کی جذباتیت کو ختم کر کے انھیں حقیقت پسند بنائے گا۔ اس کے بعد ان کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ وہ زیادہ حقیقت پسندانہ طور پر زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے۔

یہی صورت حال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت پیش آئی تھی۔ حدیبیہ کے معاملہ کو جب قرآن میں فتح مبین کہا گیا تو بعض مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ان کا ذہن اس وقت حدیبیہ کے مقام پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ فتح کو عین حدیبیہ کے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ خود حدیبیہ کے مقام پر اس وقت فتح کا کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس لیے ان کی سمجھ میں نہ آسکا کہ حدیبیہ کا معاملہ فتح مبین کا معاملہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

دور اول میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت جس فتح مبین کی خوش خبری دی گئی تھی وہ مقام حدیبیہ سے باہر تھی۔ اسی طرح آج اجودھیا کے معاملہ میں امید کا جو پہلو ہے وہ اجودھیا سے الگ پایا جاتا ہے نہ کہ خود اجودھیا میں۔

قرآن میں یہ فطری حقیقت بتائی گئی ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس مقام پر عسر کی حالت پیدا ہوئی ہے، عین اسی مقام پر اور وہیں یسر کی حالت بھی پائی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت عسر ظاہر ہوتا ہے، اسی وقت یسر بھی کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے جس کو غور و فکر کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً اسلام کے ابتدائی دور میں جب کہ میں عسر کی حالت پیدا ہوئی تو یسر کی حالت تین سو میل دور مدینہ میں ظاہر ہوئی۔ حدیبیہ میں جب عسر کا تجربہ ہوا تو یسر کے مواقع عرب کے قبائل میں اشاعت اسلام کی صورت میں سامنے آئے۔ تاتاری حملہ کے وقت جب اسلام کی سیاسی طاقت ٹوٹی تو اسلام کی دعوتی طاقت فاتح تتر بن کر ظاہر ہوگئی۔ وغیرہ۔

اسی طرح اجودھیا کے عسر میں بھی یسر کا پہلو چھپا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے۔ اور پھر دانش مندی کے ساتھ اس کو مستقبل کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے وہ کام کر دیا ہے جو سرسید بھی نہ کر سکے تھے۔ سرسید صرف کچھ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے تھے، بھارتیہ جنتا پارٹی نے عام مسلمانوں کو تعلیم کے راستہ میں ڈال دیا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۳ کی رات کو دس بجے حیدر آباد سے حبیب بھائی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے حیدر آباد کے مسلمانوں کو ہلا دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں واضح طور پر تعمیری ذہن بن رہا ہے۔ ہر آدمی ماضی کی شکایت کرنے کے بجائے مستقبل کی تعمیر کی بات کر رہا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سوچنے لگے ہیں کہ ہمیں جھگڑے والی باتوں کو نظر انداز کر کے تعلیم اور اقتصادیات اور دوسرے ترقی کے میدانوں میں اپنی جد وجہد جاری کر دینا چاہیے۔ اس عمل کو تیز تر کرنے کے لیے حبیب بھائی اور ان کے ساتھیوں نے طے کیا ہے کہ اپنے علاقہ میں الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیں۔

اس گفتگو کے بعد میں اپنے بستر پر سو گیا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے دوبارہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی کہ میں مسز زبیر رضوی ریڈیو اسٹیشن سے بول رہی ہوں۔ ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ دہلی میں مسلم خواتین کی بیداری کا کام کریں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں میں تعمیری ذہن پیدا کریں۔ ان کو نفرت اور شکایت والی سوچ سے بچائیں اور ان کے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ وہ جھگڑے والی باتوں سے دور رہ کر اپنے مستقبل کی تعمیر کی جد وجہد کر سکیں۔ اس کے مطابق ہم نے آج شام کو دہلی میں مسلم خواتین کا ایک اجتماع رکھا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم کو وہاں بھیجیں تاکہ وہ اس معاملہ میں ہمارا تعاون کر سکیں۔

یہ ان بہت سے تجربات میں سے صرف دو تجربہ ہے جو ۶ دسمبر کے بعد سے مسلسل سامنے آرہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو ہندستان کے مسلمانوں نے ٹریجڈی کے دن کے طور پر نہیں لیا۔ بلکہ اس کو ایک نیا فیصلہ لینے کا دن بنا دیا۔ اب انھوں نے طے کیا ہے کہ مسلم لیڈروں کی دوسروں کے خلاف شکایتی تقریروں اور غیر مسلم انتہا پسندوں کے اشتعال انگیز نعروں کو نظر انداز کر کے "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ تعلیم کا رجحان مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک صحت مند فیصلہ ہے۔ اور جو لوگ ایسا فیصلہ کر لیں، ان کی ترقی کسی بھی حال میں اور کسی بھی مقام پر رکنے والی نہیں۔

ایک تقریر

آج کی بحث کا موضوع ہے : ہماری ری پبلک ۶ دسمبر کے بعد (Our Republic - Post 6 December 1992) انڈیا کی تاریخ میں ۶ دسمبر کا واقعہ بلاشبہ ایک ہلا دینے والا واقعہ ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہماری ری پبلک کے ڈھانچہ میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی آنے کا امکان نہیں۔ اس کے کئی واضح اسباب ہیں۔

۱۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ ایک کھلا ہوا تشدد کا واقعہ تھا۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ اگر کسی کو یقین ہو کہ وہ غیر متشددانہ طور پر اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے تو وہ کبھی تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ تشدد کا طریقہ اختیار کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے لیے پُرامن اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے تو ۶ دسمبر کا واقعہ اصحابِ واقعہ کے لیے اپنی نفی آپ (سلف نگیشن) کے ہم معنی تھا۔ جن لوگوں نے یہ تشدد کیا، انھوں نے ایسا کر کے خود اپنے آپ کو پیچھے دھکیل دیا ہے نہ کہ ہماری ڈیموکریٹک سیکولر ری پبلک کو۔ ۶ دسمبر کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے پیچھے جو تحریک ہے، یہ اس کے لیے خاتمہ کا آغاز (blessing in disguise) کے ہم معنی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ جس مذہبی۔ سیاسی تحریک نے ۶ دسمبر کا واقعہ کیا وہ دراصل پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں چلنے والی ان تحریکوں کا بھارتی ایڈیشن ہے جس کو عام طور پر اسلامائزیشن کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اسلامائزیشن کی یہ تحریکیں اس سے پہلے پاکستان اور مصر اور دوسرے کئی مسلم ملکوں میں زور و شور سے چلائی گئیں۔ لیکن ہر جگہ وہ ناکام رہیں۔ مسلم ملکوں کی ان تحریکوں نے وقتی طور پر سماج میں کچھ ازعاج (nuisance) تو ضرور پیدا کیا۔ مگر اس سے آگے ملک کا نقشہ بدلنے میں وہ کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں کی یہ تحریکیں دراصل خلاف زمانہ تحریکیں تھیں۔ وہ اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف تھیں۔ ٹھیک اسی طرح انڈیا کی مذہبی۔ سیاسی تحریک بھی اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ بھی زیادہ سے زیادہ سماج میں کچھ ازعاج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے

آگے وہ کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ زمانہ سے لڑکر اپنا ایک الگ سیاسی جزیرہ بنا سکے۔ مسلم فنائٹزم مسلم ملکوں میں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اسی طرح ہندو فنائٹزم بھی یہاں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

۳۔ انڈیا کی یہ مذہبی۔ سیاسی تحریک بنیادی طور پر ہندی اسپیکنگ کمیونٹی کی تحریک ہے۔ اس کا سب سے بڑا مرکز یوپی ہے جہاں ایک ہی ریاست میں پارلی منٹ کی ۸۵ سیٹیں موجود ہیں۔ اس تحریک کا خاص ایڈوانٹج یہ ہے کہ وہ ہندی اسپیکنگ ریاستوں کے ووٹروں کے تقریباً ۲۵ فیصد حصہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، مگر اس کا سب سے بڑا ایڈوانٹج ہی اس کا سب سے بڑا ڈس ایڈوانٹج بھی ہے، کیوں کہ اس کی جس صفت میں نصف انڈیا کے لیے اپیل ہے، وہی صفت بقیہ نصف میں اس کو غیر معقول بنا دیتی ہے۔ یہ انڈیا کا غیر ہندی خواں علاقہ ہے۔

ساؤتھ انڈیا کے سلسلہ میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ وہ ہندی کے لسانی غلبہ کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر وہ ہندی کے لسانی غلبہ کے ساتھ ہندی دانوں کے سیاسی غلبہ کو کس طرح گوارا کرے گا۔

۴۔ مذہب کا کام کیرکٹر بلڈنگ ہے، مذہب کا کام گورنمنٹ بلڈنگ نہیں۔ مذہب سے اگر کیرکٹر بنانے کا کام لیا جائے تو یہ مذہب کی تعمیل ہے۔ لیکن اگر مذہب کو گورنمنٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ مذہب پر عمل کرنا نہیں، یہ مذہب کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اکسپلائٹیشن کبھی بھی بہت دیر تک کارآمد نہیں ہوتا۔

کسی بھی چیز کا غلط استعمال (misuse) کرنا برا ہے۔ اور مذہب جیسی مقدس چیز کا غلط استعمال کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مذہب کو اکسپلائٹیشن کا ذریعہ بناتے ہیں وہ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتے۔

اس قسم کے مختلف اسباب ہیں جو واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ۶ دسمبر نے ہماری ری پبلک کے لیے کوئی قابل لحاظ مسئلہ پیدا نہیں کیا ہے۔ کچھ وقتی خلفشار کے بعد ہماری گاڑی دوبارہ اپنی پٹری پر آجائے گی۔ اور پھر وہ اسی طرح چلنے لگے گی جس طرح وہ اس سے پہلے چل رہی تھی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

دو

یرالقرآن جلد اول	200/-
یرالقرآن جلد دوم	200/-
ﷲ اکبر	45/-
یغمبر انقلاب	40/-
ہب اور جدید چیلنج	45/-
ظمتِ قرآن	30/-
ظمتِ اسلام	6/-
ظمتِ صحابہ	6/-
ین کامل	50/-
لاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
سلامی زندگی	25/-
حیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراطِ مستقیم	40/-
تون اسلام	45/-
وشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
یوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
قوال حکمت	20/-

انوارِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	6/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحادِ ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیاتِ طیبہ	6/-
باغِ جنت	6/-
نارِ جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیاتِ اسلام	–
تعددِ ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقت اسلام	–
علماء اور دورِ جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرتِ رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-

ہندی

سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-

عربی

الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقتِ ایمان	25/-
A-2	حقیقتِ نماز	25/-
A-3	حقیقتِ روزہ	25/-
A-4	حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقتِ حج	25/-
A-6	سنتِ رسولؐ	25/-
A-7	میدانِ عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحادِ ملت	25/-
A-12	تعمیرِ ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ وتفسیر)

A-14	متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	200/-
V-2	اسلام داعی امن	200/-
V-3	اسلام دورِ جدید کا خالق	200/-
V-4	امتِ مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6	اسلام اور دورِ حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad	75/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	–
Introducing Islam	–
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	–
Islam the Creator of Modern Age	–
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	–
Words of Wisdom	–

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984 تا 1991 — 80/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91 — 85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

THE ISLAMIC CENTRE C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013